Re 1 00 for over-night books per day shall be charged from those who return them late

damage done to the book and will have to replace it if the same is detected at the time of return

موضوع: ادب - شاعری۔

مصنف اقبال (محمد) -

نام کتاب ترجمان زبور -

مولف/~~مرتب~~/مترجم/~~شارح/ملخص~~ ایس اے رحمان - **ایڈیشن** ×

مقام اشاعت مع سنہ لاہور ۱۹۷۷ء

ناشر/مطبع اقبال اکادمی پاکستان -

صفحات ۲۷۹ **تصاویر وغیرہ** علامہ اقبال صاحب کی تصاویر۔

سلسلہ ×

توضیح

کتب خانہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی 110025 -

ترجمانِ زبور

منظوم اُردُو ترجمہ

مترجمہ

جسٹس (ریٹائرڈ) ایس۔اے رحمٰن

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبالؒ

اِقبال اکادمی پاکستان

۹۰۔بی۔۲۔گلبرگ ۳ ○ لاہور

ناشر : ڈاکٹر محمد معز الدین
ڈائرکٹر : اقبال اکادمی پاکستان
۹۰ بی - ۲ گلبرگ نمبر ۳ لاہور

مطبع : زرین پرنٹنگ پریس لمٹیڈ
باہتمام مرزا محمد صادق
۴ - لنک روڈ لاہور

طبع اول : ۱۹۷۷

تعداد : ۱۱۰۰



علّامہ محمّد اقبالؒ

(۱۸۷۷ — ۱۹۳۸)

۷۸۶

پیش لفظ

۱۹۷۷ء کو ایک سرکاری اعلان کے مطابق علامہ اقبالؒ کا سال قرار دیا گیا ہے۔ اسی سال نومبر میں علامہ کی پیدائش کو سو سال ہو جائیں گے۔ حکومت کے پیشِ نظر اقبالؒ کے جشنِ صدی منانے کا ایک وقیع پروگرام ہے۔ مجوزہ جشنِ صدی کے سلسلہ کی ایک کڑی علامہ کے فارسی کلام کو، تفہیمِ عوام کی خاطر، اردو نظم کے قالب میں پیش کرنا ہے۔ جشنِ صدی کی قومی کمیٹی کی مجلسِ منتظمہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کام کی ذمہ داری جناب فیض احمد فیض، جناب رفیق خاور اور راقم کو تفویض کی جائے۔ ازرہِ امتثالِ امر راقم نے "زبورِ عجم" کے ترجمہ کا کام اپنے ذمے لیا۔

"زبور عجم" کی اہمیت علامہ ہی کے ایک شعر سے واضح ہوتی ہے۔ "بال جبریل" کی ایک غزل میں ارشاد ہوا ہے:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

ترجمانِ زبور" علامہ کی "زبورِ عجم" کے حصہٴ اول و حصہٴ دوم کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ "گلشنِ راز جدید" اور "بندگی نامہ" کا ترجمہ اس میں شامل نہیں ہے۔ ان دونوں حصوں کا رنگ اور اُن کی فضا پہلے دو حصوں سے الگ ہے۔

ترجمہ شعر نہ شعر ہے۔ اس قسم کے ترجمہ کی راہ میں جو مشکلیں حائل ہیں، اُن کا مجھے کماحقہ، احساس ہے۔ پھر جب کلام علامہ اقبال جیسے نابغہٴ روزگار کا ہو تو اصل کی ہیئت اور روح کو برقرار رکھنے کا ارادہ حوصلہ طلب ہے۔ بہر حال جو کچھ

اس مختصر مدت میں ہوسکا ، پیش خدمت ہے ۔ ترجمہ کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قارئین کی صوابدید پر ہے ۔

میں محبی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا تہہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا مسودہ بالاستیعاب دیکھا اور بعض نہایت مفید مشورے دئے ۔ انھوں نے بکمالِ عنایت پروف خوانی میں بھی مجھ سے شرکت کی ہے ۔ میں ڈاکٹر معزالدین ، ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور کا بھی ممنون ہوں جن کا تعاون اشاعتِ کتاب کے تمام مرحلوں میں مجھے حاصل رہا ۔

ایس ۔ اے رحمان

لاہور
۱۲ ستمبر ۱۹۷۷ء

ترجمانِ زبور

ایس - اے رحمٰن

بخوانندهٔ کتابِ زبور

می شود پردهٔ چشمم پرِ کاهے گاهے
دیده ام هر دو جهاں را بنگاهے گاهے

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادهٔ صد ساله بآهے گاهے

در طلب کوش و مده دامنِ امید ز دست
دولتے هست که یابی سرِ راهے گاهے

زبور کے قاری سے

آنکھ کا پردہ ہوا مجھ کو پرِ کاہ کبھی
آنکھ میری دو جہاں سے ہوئی آگاہ کبھی

عشق کی وادی بہت دور ہے گرچہ لیکن
راہِ صد سالہ ہوئی طے ہے بیک آہ کبھی

رشتہ امید سے قائم رہے ، پیہم ہو طلب
ایک دولت ہے کہ ملتی ہے سرِ راہ کبھی

زبورِ عجم

حصہ اول

ز برونِ در گرشتم، ز درونِ خانہ گفتم!
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم!

زبورِ عجم

حصہ اول

دی برونِ در سے میں نے خبرِ درونِ خانہ!
جو کہی نہ تھی کسی نے وہ کہی قلندرانہ!

دعا

یا رب درونِ سینه دلِ با خبر بده
در باده نشّه را نگرم آن نظر بده

این بنده را که با نفسِ دیگران نزیست
یک آهِ خانه زاد مثالِ سحر بده

سیلم، مرا بجوئے تنک مایهٔ مپیچ!
جولانگہے بوادی و کوه و کمر بده!

سازی اگر حریفِ یمِ بیکران مرا
با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بده

شاهینِ من بصیدِ پلنگاں گزاشتی!
همت بلند و چنگل ازیں تیز تر بده

رفتم که طائرانِ حرم را کنم شکار
تیرے که نا فگنده فتد کارگر بده

خاکم به نورِ نغمهٔ داؤد بر فروز
هر ذرهٔ مرا پر و بالِ شرر بده

دُعا

یا رب تری جناب سے دل با خبر ملے
جو مے میں نشّہ دیکھ لے، ایسی نظر ملے
اس بندے کو جو غیر کے بل پر نہیں جیا
اک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر ملے
الجھا نہ میرے سیل کو اک جوے تنگ میں
میری گزر کو وادی و کوہ و کمر ملے
مجھ کو سمندروں کا کیا ھے اگر حریف
لہروں کو میری بے کلی، تہ کو گہر ملے
چیتوں کو میرے شاھیں کی زد میں جو ھے رکھا
ہمت بلند، چنگل اسے تیز تر ملے
نکلا ھوں طائرانِ حرم کے شکار کو
وہ تیر بن چلے جو رھے کارگر، ملے
روشن ھو میری خاک فروغِ زبور سے
میرے ھر ایک ذرے کو تاب شرر ملے

بسم الله الرحمن الرحیم

۱

عشقِ شور انگیز را هر جاده در کوئے تو بُرد
بر تلاشِ خود چه می نازد که ره سوئے تو بُرد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱

عشق ہر اک راہ سے پابستہ تجھ تک لے گیا
جستجو پر ناز کیا، خود رستہ تجھ تک لے گیا

۲

درونِ سینهٔ ما سوزِ آرزو ز کجا ست؟
سبو ز ما ست ولے بادہ در سبو ز کجا ست؟
گرفتم این که جہان خاک و ما کفِ خاکیم
بہ ذرہ ذرۂ ما دردِ جستجو ز کجا ست؟
نگاہِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد
جنونِ ما ز کجا شورِ ہائے و ہُو ز کجاست؟

۲

کہاں سے سینۂ انساں میں سوزِ آرزو آیا؟
سبو میرا ، کہاں سے بادۂ آئینہ رُو آیا؟

یہ مانا خاک ہے عالم ، مرا تن مشتِ خاکی ہے
کہاں سے میرے ہر ذرے میں دردِ جستجو آیا؟

نظر پڑتی ہے میری کہکشاں کے بھی گریباں پر
کہاں سے یہ جنوں آیا ، یہ شورِ ہائے وُہو آیا؟

۳

غزل سرائے و نواهائے رفته باز آور
بایں فسرده دلاں حرفِ دل نواز آور

کنشت و کعبه و بتخانه و کلیسا را
هزار فتنه ازاں چشمِ نیم باز آور

زبادهٔ که خاکِ من آتشے آمیخت
پیالهٔ بجوانانِ نو نیاز آور!

نۓ که دِل ز نوایش بسینه می رقصد
مۓ که شیشهٔ جاں را دهد گداز آور

به نیستانِ عجم بادِ صبحدم تیز است
شرارهٔ که فرو می چکد ز ساز آور

۳

غزل سرا ہو، سرودِ کہن کو دے آواز
سنا فسردہ دلوں کو نوائے قلب نواز

کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا پر
ہوں چشم نیم کشادہ سے فتنوں کے در باز

جو میری خاک میں شعلہ فشاں ہے آس مے سے
دے نونیاز جوانوں کو اک پیالۂ ناز

وہ نے ہو جس کی نوا دل کو رقص میں لائے
وہ مے ہو شیشۂ جاں جس سے پائے سوز و گداز

ہے نیستانِ عجم میں ہوا سحر کی تیز
شرر کہاں ہے کہ ٹپکائے میرا تارِ ساز

۴

اے که زمن فزودهٔ گرمئی آه و ناله را
زنده کن از صدائے من خاکِ هزار ساله را

با دلِ ما چها کنی! تو که بادهٔ حیات
مستیٔ شوق می دهی آب و گِلِ پیاله را

غنچهٔ دل گرفته را از نفسم گره کشائے
تازه کن از نسیم من داغِ درونِ لاله را

می گزرد خیالِ من از مه و مهر و مشتری!
تو به کمیں چه خفتهٔ صید کُن این غزاله را

خواجهٔ من! نگاه دار آبروے گدائے خویش
آنکه ز جوے دیگراں پُر نکند پیاله را

۴

مجھ سے ملی ہیں وسعتیں گرمیٔ آہ و نالہ کو
میری صدا سے زندہ کر خاکِ ہزار سالہ کو

گزرے گی اپنے دل پہ کیا تو نے مرے حیات سے
مستیِ شوق کی عطا ، آب و گِلِ پیالہ کو

غنچہ کے دل کی ہر گرہ کھول سکے مرا نفس
تازگی دے مری صبا داغِ درونِ لالہ کو

مہر و مہ و ستارہ سے آگے نکل گیا خیال
سویا ہے تو کمین میں کیوں ، قید کر اس غزالہ کو

اے مرے خواجہ ! لاج رکھ اپنے گدائے خاص کی
غیر کی جُو سے پرُ نہیں جس نے کیا پیالہ کو

۵

از مشتِ غبارِ ما صد ناله برانگیزی
نزدیک تر از جانی با خوے کم آمیزی!

در موجِ صبا پنهاں دزدیده بباغ آئی
در بوے گل آمیزی، با غنچه در آویزی!

مغرب ز تو بیگانه . مشرق همه افسانه
وقت است که در عالم نقشِ دگر انگیزی!

آنکس که بسر دارد سوداے جهانگیری
تسکینِ جنونش کن با نشترِ چنگیزی!

من بندهٔ بے قیدم شاید که گریزم باز
ایں طرهٔ پیچاں را در گردنم آویزی

جز ناله نمی دانم گوئند غزل خوانم
ایں چیست که چوں شبنم به سینهٔ من ریزی؟

۵

پیہم تنِ خاکی کو کیا تو نے فغاں خیز
نزدیک تراز جاں ہے مگر خو میں کم آمیز!

پردے میں صبا کے تو چھپا ، باغ میں آیا
خوشبو میں سمایا ہے تو غنچے میں نمو بیز!

مغرب ترا بیگانہ تو مشرق ہے فسانہ
ہے وقت ، بنے نقش کوئی اور دل آویز!

جس سر میں جہانگیری کا سودا کہیں ابھرے
ہو اس کا مسیحائے جنوں نشترِ چنگیز!

میں بندۂ آزاد ہوں ، پھر ہوں نہ گریزاں
گردن میں حمائل ہو ترا طرۂ شبدیز

نالہ ہوں سراپا، مجھے سمجھے ہیں غزل خواں
یہ اوس سی کیا ہے مرے سینے پہ گہر ریز؟

۶

من اگرچه تیره خاکم دلکے است برگ و سازم
بنظارهٔ جمالے چو ستاره دیده بازم

به هوائے زخمهٔ تو همه نالهٔ خموشم
تو بایں گماں که شاید ز نوا فتاده سازم

بضمیرم آں چناں کن که ز شعلهٔ نوائے
دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریاں گدازم

تب و تابِ فطرتِ ما ز نیازمندیٔ ما
تو خدائے بے نیازی نرسی بسوز و سازم!

بکسے عیاں نکردم ز کسے نہاں نکردم
غزل آنچناں سرودم که بروں فتاد رازم!

٦

ہوں تیرہ خاک مگر دل ہے برگ و ساز مرا
برائے دید جُوں انجم ہے دیدہ باز مرا

ہوں تیرے زخمہ کی حسرت میں نالۂ خاموش
تجھے گماں کہ نوا سے تہی ہے ساز مرا

وہ سوز دے کہ فروزاں کروں دلِ خاکی
سُنے جو نُوری تو نغمہ ہو دل گداز مرا

نیازمندی سے فطرت مری ہے بے تابی
تو بے نیاز نہ پائے گا سوز و ساز مرا

عیاں کیا نہ نہاں رکھا میں نے غیروں سے
غزل سرائی نے افشا کیا ہے راز مرا!

بصدائے درد مندے بنوائے دلپذیرے
خمِ زندگی کشادم بجهانِ تشنه میرے!

تو بروں نے نوائے درِ آں جهاں کشادی
که هنوز آرزویش نه دمیده در ضمیرے!

ز نگاهِ سرمه سائے بدل و جگر رسیدی
چه نگاهِ سرمه سائے! دو نشانه زد به تیرے!

نگاهِ نارسایم چه بهارِ جلوه دادی
که بباغ و راغ نالم چو تدروِ نو صفیرے

چه عجب اگر دو سلطاں به ولایتے نه گنجد
عجب ایں که می نگنجد بدو عالمے فقیرے!

۷

مری دردمند صدا اٹھی ، مری دلپذیر نوا اٹھی
ہوئے جتنے پیاسے تھے جاں بلب ، انھیں مل گیا ُخم زندگی !

میں ہوں بے نوا مگر اے خدا ، وہ دکھایا تو نے مجھے جہاں
ہوئی پیدا جس کی نہ آرزو کسی دل کی خلوتوں میں ابھی !

اٹھی یوں نظر تری سرمہ سا کہ دل وجگر میں اتر گئی
دو شکار ایک ہی تیر سے ، ہے عجب نظر کی فسوں گری !

مری نارسا سی نظر کو بھی وہ بہارِ جلوہ عطا ہوئی
کہ میں اب ہوں گویا تدرو جس کو زباں ملی ہو نئی نئی

نہیں یہ عجب کہ نہ رہ سکیں ایک مملکت میں دو حکمراں
ہے عجب کہ وسعتِ دوجہاں نہ ہو اک فقیر کو مکتفی !

۸

بر سرِ کفر و دیں فشاں رحمتِ عامِ خویش را
بندِ نقاب برکشا ماهِ تمامِ خویش را

زمزمهٔ کهن سرائے گردشِ باده تیز کن
بار به بزمِ ما نگر، آتشِ جامِ خویش را

دام ز گیسواں بدوش زحمتِ گلستان بری
صید چرا نمی کنی طائرِ بامِ خویش را

ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنه کام
خونِ حسین بازده کوفه و شامِ خویش را

دوش براهِر زند، راهِ یگانه طے کند
می ندهد بدستِ کس عشق زمامِ خویش را

ناله بآستانِ دیر بے خبرانه می زدم
تا بحرم شناختم راه و مقامِ خویش را

قافلهٔ بہار را طائرِ پیش رس نگر
آنکه بخلوتِ قفس گفت پیامِ خویش را

۸

فرق نہ کفر و دیں میں ہو ؛ اذن دے فضلِ عام کو
زیرِ نقاب اب نہ رکھ، اپنے مہِ تمام کو

زمزمۂ کہن سنا، گردشِ بادہ تیز کر
بزم میں آ کے دیکھ پھر آتشِ تیزِ جام کو

شانہ پہ دامِ گیسواں رکھ کے چلا ہے باغ کو
کرتا نہیں شکار کیوں اپنے عقابِ بام کو

ریگِ عراق منتظر، پیاسی حجاز کی زمیں
خونِ حسین پھر ملے کوفہ و خاکِ شام کو

چھوڑ کے رہنما چلا ، تنہا ہی رہ گرا ہوا
دے گا نہ دستِ غیر میں عشق کبھی زمام کو

بے خبری میں نالہ زن دیر کے آستاں پہ تھا
آ کے حرم میں پا لیا اپنے رہ و مقام کو

قافلۂ بہار کا طائرِ پیش رس ہوں میں
اپنے قفس میں رہ کے ہی نشر کیا پیام کو

۹

نوائے من ازاں پر سوز و بے باک و غم انگیز است
خاشاکم شرر افتاد و بادِ صبحدم تیز است

ندارد عشق سامانے و لیکن تیشهٔ دارد
خراشد سینهٔ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

مرا در دل خلید این نکته از مردِ ادا دانے
ز معشوقاں نگه کاری تر از حرفِ دلاویز است

بیا نیم بیا یکدم نشیں کز دردِ مہجوری
تہی پیمانهٔ بزم ترا ۔ پیمانه لبریز است

به بستاں جلوه دادم آتشِ داغِ جدائی را
نسیمش تیز تر می سازد و شبنم غلط ریز است

اشارتہائے پنہاں خانماں برہم زند لیکن
مرا آں غمزه می باید که بیباک است و خونریز است

نشیمن هر دو را در آب و گِل لیکن چه راز است این
خرد را صحبتِ گِل خوشتر آید دل کم آمیز است

مرا بنگر که در هندوستاں دیگر نمی بینی
برهمن زادهٔ رمز آشنائے روم و تبریز است

۹

نوا میری ہوئی پرسوز ، بےباک اور غم انگیز
مرے خس میں پڑی چنگاری اور بادِ سحر ہے تیز
نہیں ہے ایک تیشہ کے سوا کچھ عشق کا ساماں
یہ چیرے سینۂ کہسار بے داغِ دم[۱] پرویز
مرے دل میں خلش گر ہے یہ نکتہ اک ادا داں کا
نگہ محبوب کی ہے کاری تر از حرفِ دلآویز
مرے بالیں پہ آ اور بیٹھ جا ، دردِ جدائی سے
بس اب ترے تہی پیمانہ کا پیمانہ ہے لبریز
دکھایا جلوہ میں نے آتشِ ہجراں کا گلشن میں
ہوا نے اور بھڑکایا اسے ، شبنم ہوئی گل ریز
یہ مانا خانہ بر انداز ہیں پہاڑ اشارے بھی
وہ غمزہ چاہئے مجھ کو جو ہو بےباک اور خونریز
نشیمن دونو آب و گل میں رکھتے ہیں مگر یہ کیا
خرد تو صحبتِ گل سے ہے خوش اور دل ہے کم آمیز
مجھے دیکھو کہ مجھ سا ہند میں کوئی نہ پاؤ گے
برہمن زادہ کو سمجھا گئے کچھ روم اور تبریز

۱ - دم - خون -

۱۰

دل و دیدهٔ که دارم همه لذتِ نظاره
چه گنه اگر تراشم صنمے ز سنگِ خاره

تو به جلوه در نقابی که نگاه بر نتابی
مهِ من! اگر ننالم تو بگو دگر چه چاره!

چه شود اگر خرامی بسرائے کاروانے
که متاعِ نارواتش دلکے است پاره پاره

غزلے زدم که شاید بنوا قرارم آید
تبِ شعله کم نه گردد ز گسستنِ شراره

دلِ زندهٔ که دادی به حجاب در نسازد
نگہے بده که بیند شررے به سنگِ خاره

همه پارهٔ دلم را ز سرورِ او نصیبے
غمِ خود چسان نهادی بدلِ هزار پاره!

نکشد سفینهٔ کس به یمِ بلند موجے
خطرے که عشق بیند بسلامتِ کناره!

سخنِ نے نیازی ز خدایگاں گزشتم
صفتِ مهِ تمامے که گزشت بر ستاره!

۱۰

دل و دیدہ جب سراپا ہوئے لذتِ نظارہ
تو میں کیوں نہ پھر تراشوں کوئی بت زسنگِ خارہ
ترا جلوہ بھی ہے پردہ کہ نظر نہ رخ پہ ٹھہرے
مرے ماہ! نالہ گر ہوں، مرا اور کیا ہے چارہ!
کبھی آ ھی نکلے تو بھی مری کاروانسرائے میں
میرے پاس جنسِ کاسد ہے دل ایک پارہ پارہ
میں غزل سرا ہوا تھا کہ قرار آئے جی کو
تبِ شعلہ کیسے کم ہو، بہ شکستِ یک شرارہ
دلِ زندہ جب دیا ہے تو حجاب کیوں ہو حائل
وہ نظر ملے کہ دیکھوں میں شرر درونِ خارہ
مرے دل کے ریزے ریزے نے سرور اس سے پایا
ترا غم سمایا کیسے بہ دلِ ہزار پارہ
نہ چلا سکیگا کشتی کسی کی میانِ طوفاں
وہ جو خطرہ عشق کو ہے بسلامتِ کنارہ
میں بہ شانِ بے نیازی یوں خدایگاں سے گزرا
چلے جیسے ماہِ کامل پرے چھوڑ کر ستارہ!

۱۱

گرچه شاهینِ خرد بر سرِ پروازے هست
اندریں بادیه پنهاں قدر اندازے هست

آنچه از کارِ فروبسته گره بکشاید
هست و در حوصلهٔ زمزمه پردازے هست

تابِ گفتار اگر هست شناسائے نیست
وائے آں بنده که در سینهٔ او رازے هست!

گرچه صد گونه بصد سوز مرا سوخته اند
اے خوشا لذتِ آں سوز که هم سازے هست

مرده خاکیم و سزاوارِ دلِ زنده شدیم!
ایں دلِ زنده و ما! کارِ خدا سازے هست!

شعلهٔ سینهٔ من خانه فروز است ولے
شعلهٔ هست که هم خانه بر اندازے هست!

تکیه بر عقلِ جهاں بینِ فلاطوں نکنم
در کنارم دلکے شوخ و نظر بازے هست!

۱۱

گرچہ شاہینِ خرد برسرِ پرواز رہا
لیکن اس دشت میں پنہاں قدر انداز رہا!

وہ فسوں، کارِ فروبستہ کی کھولے جو گرہ
خاصۂ حوصلۂ زمزمہ پرداز رہا

تابِ گفتار تو ہے کوئی شناسا ہی نہیں
آہ وہ جس کا نہاں سینے ہی میں راز رہا!

گرچہ سو رنگ میں بخشا گیا ہے سوز مجھے
لذت اس سوز کی جو سوز ہوا، ساز رہا

خاکِ مردہ تھے، سزاوارِ دلِ زندہ ہوئے!
میل دونوں کا عجب کارِ خدا ساز رہا!

خانہ افروز ہے شعلہ مرے سینے میں مگر
اک وہ شعلہ بھی ہے جو خانہ بر انداز رہا!

تکیہ میں نے نہ کیا عقلِ فلاطوں پہ کبھی
دل مرے پہلو میں شوخ اور نظر باز رہا!

این جهان چیست؟ صنم خانهٔ پندارِ من است!
جلوهٔ او گِروِ دیدهٔ بیدارِ من است!
همه آفاق که گیرم بنگاهے او را
حلقهٔ هست که از گردشِ پرکارِ من است
هستی و نیستی از دیدن و نا دیدنِ من
چه زمان و چه مکان، شوخیٔ افکارِ من است!
از فسون کاریٔ دل، سیر و سکون، غیب و حضور!
این که غماز و کشائندهٔ اسرارِ من است
آن جہانے که درو کاشته را می دروند
نور و نارش همه از سجه و زنارِ من است
سازِ تقدیرم و صد نغمهٔ پنہاں دارم
هر کجا زخمهٔ اندیشه رسد تارِ من است

اے من از فیضِ تو پاینده! نشانِ تو کجا است؟
این دو گیتی اثرِ ماست جہانِ تو کجا است؟

۱۲

جہاں کیا ہے صنمخانہ ہے میرے ہی خیالوں کا!
مرا ہی دیدۂ بیدار ، منبع اُس کے جلووں کا!
جہانِ چار سُو جس پر ہے حاوی اک نگہ میری
یہ حلقہ ہے مرے پرکار کی گردش کے نقطوں کا
جو دیکھوں میں تو ہستی ہے ، نہ دیکھوں تو عدم ہر شے
زماں ہو یا مکاں ہو ، نقش ہے مری ہی سوچوں کا
حضور و غیب ہو ، سیر و سکوں ہو، دل کا جادو ہے
یہ ہے کاشف ، یہ ہے غماز ، میرے سارے بھیدوں کا
وہ عالم جس میں اپنا بویا ، کاٹا جائے گا آخر
ہے نور و نار میں اُس کے اثر میرے طریقوں کا
میں ہوں تقدیر کا وہ ساز جس میں نغمے پنہاں ہیں
جہاں ہو فکر کا زخمہ ، وہیں سُر میرے تاروں کا

ہوں تیرے فیض سے پائندہ ، مل جائے نشاں تیرا
یہ دو عالم ہمارے ہیں، کہاں ڈھونڈیں جہاں تیرا؟

فصلِ بهار این چنین بانگِ هزار این چنین
چهره کشا . غزل سرا باده بیار این چنین

اشکِ چکیده ام به بین هم به نگاهِ خود نگر
ریز به نیستانِ من برق و شرار این چنین

بادِ بهار را بگو . پےِ بخیالِ من برد
وادی و دشت را دهد نقش و نگار این چنین

زادهٔ باغ و راغ را از نفسم طراوتے
در چمنِ تو زیستم با گُل و خار این چنین

عالمِ آب و خاک را بر محکِ دلم بسائے
روشن و تارِ خویش را گیر عیار این چنین

دل بکسے نباخته با دو جهان نساخته!
من بحضورِ تو رسم روزِ شمار این چنین

فاختهٔ کهن صفیر نالهٔ من شنید و گفت
کس نه سرود در چمن نغمهٔ پار این چنین

۱۳

فصلِ بہار اس طرح ، بانگِ ہزار اس طرح
چہرہ دکھا ، غزل سنا ، مے کو نکھار اس طرح

ٹپکے ہیں اشک جو مرے ، آن پہ تری نگاہ ہو
میرے نیستاں میں گِرا ، برق و شرار اس طرح

بادِ بہار سے کہو ، ہو مری پیروِ خیال
وادی و دشت کو ملے نقش و نگار اس طرح

تازہ مرے نفس سے ہیں زادۂ باغ و راغ سب
تیرے چمن میں میں رہا ، با گُل و خار اس طرح

دل کو مرے محک بنا ، عالمِ آب و خاک کی
تیرے سیہ سفید کا یہ ہو عیار اس طرح

ہو مرا قلبِ خود نگر ، دونوں جہاں سے بے نیاز
آؤں ترے حضور میں روزِ شمار اس طرح

میری صدا پہ بول اٹھی نغمہ شناس فاختہ
ہم نے سنا نہیں کبھی نغمۂ پار اس طرح

۱۴

برون کشید ز پیچاکِ هست و بود مرا
چه عقده‌ها که مقامِ رضا کشود مرا

تپید عشق و درین کشتِ نابسامانے
هزار دانه فرو کرد تا درود مرا

ندانم این که نگاهش چه دید در خاکم
نفس نفس بعیارِ زمانه سود مرا

جهانے از خس و خاشاک درمیان انداخت
شرارهٔ دلکے داد و آزمود مرا

پیاله گیر ز دستم که رفت کار از دست
کرشمه بازیٔ ساقی ز من ربود مرا!

۱۴

کر دیا ہست و بود کے مخمصوں سے رہا مجھے
عقدوں کا حل سمجھا گیا مرتبۂ رضا مجھے

دانے ہزار عشق نے بوئے اس ارضِ زار میں
ہونے لگی درو جو فصل، پایا فقط بپا مجھے

دیکھا نہ جانے اس نے کیا میری ہی مشتِ خاک میں
ہر دم زمانہ کا عیار اس نے بنا لیا مجھے

لا کے جہانِ خار و خس رکھ دیا میرے سامنے
دے کے شرارِ دل کیا حوصلہ آزما مجھے

جام کو میرے ہاتھ سے لے لو کہ یارو میں چلا
ساقیٔ فتنہ کار نے مجھ سے کیا جدا مجھے

۱۵

خیز و جاکِ تشنهٔ ، بادهٔ زندگی فشان
آتشِ خود بلند کن آتشِ ما فرونشان

میکدهٔ تہی سبو حلقهٔ خود فرامشان
مدرسهٔ بلند بانگ بزمِ فسرده آتشان

فکرِ گرہ کشا ، علام ، دیں بروائتے تمام
زانکه درونِ سینه ها دل هدفے است بے نشان

هر دو بمنزلے روان هر دو امیرِ کاروان
عقل بحیله می برد ، عشق برد کشان کشان

عشق ز پا در آورد خیمهٔ شش جهات را
دست دراز می کند تا به طنابِ کهکشان

۱۵

پیاسی ہے خاک، آ اسے بادۂ زندگی پلا
اپنی لگی کو تیز کر، میری لگی کو بھی بجھا

حلقۂ خود فراموشاں خالی سبو پہ مست ہے
ایک فسردہ آگ ہے مدرسہ بازِ خودستا

سینوں میں دل ہے وہ ہدف جس پہ نشاں نہیں کوئی
دیں ہے روایتِ کہن، فکر غلامِ بستہ پا

دونو ہیں میرِ کارواں، منزل مگر جُدا جُدا
عشق کشاں کشاں رواں، عقل بحیلہ رہنما

کر دیا عشق نے نگوں خیمۂ شش جہات کو
دامنِ کہکشاں پہ آج ہاتھ ہے آس کا پڑ گیا

۱٦

تو بایں گماں که شاید سرِ آستانه دارم
بطوافِ خانه کارے بخداے خانه دارم

شررِ پریده رنگم، مگذر ز جلوهٔ من
که بتابِ یک دو آنے تبِ جاودانه دارم

بکمند دگر نگاهے به رهے که طے نمودم
سراغ صبحِ فردا روشِ زمانه دارم

هم عشق کشتیِ من؛ هم عشق ساحلِ من
نه غم سفینه دارم، نه سرِ کرانه دارم

شررے فشاں و لیکن شررے که وا نسوزد
که هنوز تو نیارم غم آشیانه دارم!

بامیدِ ایں که روزے بشکار خواهی آمد
ز کمندِ شهریاراں رمِ آهوانه دارم

تو اگر کرم نمائی بمعاشراں به بخشم
دو سه جام دلفروزے ز مۓ شبانه دارم

تجھے یہ گماں کہ مجھ کو ہے تلاشِ آستانہ
ہے طواف اس غرض سے کہ ملے خدا ے خانہ

گو میں رنگ اڑا شرر ہوں، مرا جلوہ دیدنی ہے
مری تاب اک دو لحظہ میں تپش ہے جاودانہ

جو گزر چکی وہ منزل نہیں دیکھتا پلٹ کر
میں سراغِ صبحِ فردا میں ہوں پیروِ زمانہ

یم عشق میری کشتی، یم عشق میرا ساحل
نہ غم سفینہ مجھ کو نہ ہے خواہش کرانہ

وہ شرر عطا ہو مجھ کو جو نہ پھونک ڈالے ہر شے
میں ہوں نو نیاز، ابھی ہے مجھے فکرِ آشیانہ!

اس امید پہ کہ اک دن تو بنے شکار آئے
میں کمندِ شہر یاراں سے ہوں رم میں آ ہوانہ

ہو کرم، معاصروں کو میں عطا کروں وہ ساغر
جو بچے ہیں پاس میرے پسِ محفلِ شبانہ

نظر به راه شیناں سواره می گزرد
مرا نگر که کارم ز چاره می گزرد

به دیگراں چه سخن گسترم ز جلوهٔ دوست
به یک نگاه مثالِ شراره می گزرد

رهِ محملِ آں ماه سخت دشوار است
چناں که عشق بدوشِ ستاره می گزرد

ز پرده بندیٔ گردوں چه جاے نومیدی است
که ناوکِ نظرِ ما ز خاره می گزرد

یمے است شبنم ما، کهکشاں کنارهٔ اوست
بیکِ شکستنِ موج از کناره می‌گزرد

بخلوتش چو رسیدی نظر باُو مکشا
که آں دمے ست که کار از نظاره می‌گزرد

من از فراق چه نالم که از هجومِ سرشک
ز راهِ دیده دلم پاره پاره می‌گزرد

۱۷

نظر میں راہ نشیں ھیں، سوار گزرا ھے
مجھے سنبھال کہ چارے سے کار گزرا ھے

بیاں ھو جلوۂ محبوب کا، تو کیسے ھو
نگاہ کی تو مثالِ شرار گزرا ھے

کٹھن ھے اِس قدر اُس ماہ کی رہِ منزل
جو عشق گزرا تو اختر سوار گزرا ھے

فلک کے پردے مجھے نا امید کیسے کریں
کہ میرا تیرِ نظرِ سِل کے پار گزرا ھے

ھے اپنی اوس سمندر، کنار کہکشاں اس کا
اٹھی جو موج، برونِ کنار گزرا ھے

نصیب اُس کی ھو خلوت تو رکھ نظر نیچی
کہ کارِ عشق نظارے کے پار گزرا ھے

فغاں فراق میں کر لوں، یہ کیا کروں دل کا
براہِ دیدہ یہ اب تار تار گزرا ہے

برعقلِ فلک پیما ترکانه شبیخون به
یک ذرهٔ دردِ دل از علم فلاطون به

دی مغ بچهٔ با من اسرارِ محبت گفت
اشکے که فرو خوردی از بادهٔ گلگون به

آن فقر که بے تیغے صد کشورِ دل گیرد
از شوکتِ دارا به، از فرِّ فریدون به

در دیرِ مغان آئی مضمونِ بلند آور
در خانقهِ صوفی افسانه و افسون به

در جوئے روانِ ما، بے منتِ طوفانے
یک موج اگر خیزد آن موج ز جیحون به

سیلے که تو آوردی در شہر نمی گنجد
این خانه بر اندازے در خلوتِ ہاموں به

اقبالِ غزل خوان را کافر نتوان گفتن
سودا بدماغش زد از مدرسه بیرون به

۱۸

فلک رس عقل کو کر بس میں، بے باکانہ شبخوں سے
ہے دردِ دل کا اک ذرہ سوا علم فلاطوں سے

یہ کھولے مجھ پہ اسرارِ محبت مغ بچے نے کل
جو آنسو پی لیا تو نے، وہ بہتر جام گلگوں سے

دلوں کے جو کرے تسخیر کشور، فقرِ بے شمشیر
وہ بہتر شوکتِ دارا سے اور فرِّ فریدوں سے

اگر دیرِ مغاں میں آئے، مضموں چاہیے عالی
حضورِ صوفی کیا بہتر فسانے اور افسوں سے

اٹھے اک موج میری جو میں گر بے منتِ طوفاں
سوا خوبی میں وہ موجِ یگانہ رودِ جیحوں سے

سمائے شہر میں کیسے یہ تیرا سیلِ بے پایاں
بنے گی خانہ برانداز کی تو دشت و ھاموں سے

نہیں اچھا کہ اقبالِ غزل خواں کو کہیں کافر
یہ بہتر ہے رہے ہر مدرسہ دور ایسے مجنوں سے

۱۹

یا مسلماں را مده فرماں که جاں بر کف بنه
یا دریں فرسوده پیکر تازه جانے آفریں
یا چناں کن یا چنیں!

یا برهمن را بفرما نو خداوندے تراش
یا خود اندر سینهٔ زناریاں خلوت گزیں
یا چناں کن یا چنیں!

یا دگر آدم که از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بهرِ امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں!

یا جهانے تازهٔ یا امتحانے تازهٔ
می کنی تا چند با ما آنچه کردی پیش ازیں
یا چناں کن یا چنیں!

۱۹

یا مسلماں سے نہ فرما جاں ہتھیلی پر رکھے
جانِ تازہ یا ہو اس فرسودہ پیکر کو عطا
فیصلہ کر اے خدا!

برھمن کو حکم دے، تازہ تراشے دیوتا
سینۂ زنّاریاں میں یا خود اپنا گھر بنا
فیصلہ کر اے خدا!

یا نیا آدم کہ جو ابلیس سے کم تر رہے
یا نیا ابلیس عقل و دیں کا ہو ظرف آزما
فیصلہ کر اے خدا!

یا کوئی تازہ جہاں ہو یا نیا ہو امتحاں
کب تک اُس کا ھی اعادہ جو ہے پہلے ہو چکا
فیصلہ کر اے خدا!

فقر بخشی؟ با شکوہِ خسروِ پرویز بخش
یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامیں
یا چناں کن یا چنیں!

یا بکُش در سینہ ٔ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں!

فقر دے تو ساتھ دے آس کے شکوہ خسروی
یا خرد اور فطرتِ روح الامیں کر دے عطا
فیصلہ کر اے خدا!

یا بجھا دے میرے دل میں آرزوے انقلاب
یا بدل دے تیری قدرت فطرتِ ارض وسما
فیصلہ کر اے خدا!

۲۰

عقل هم عشق است و از ذوقِ نگه بیگانه نیست
لیکن این بیچاره را آن جرأتِ رندانه نیست

گرچه می دانم خیالِ منزل ایجادِ من است
در سفر از پا نشستن همتِ مردانه نیست

هر زمان یک تازه جولانگاه می خواهم ازو
تا جنون فرمائے من گوید دگر ویرانه نیست

تا چنین زورِ جنون پاسِ گریبان داشتم
درجنون از خود رفتن کارِ هر دیوانه نیست

۲۰

عقل بھی ہے عشق ، بینائی سے بیگانہ نہیں
لیکن اس بیچاری میں جرأت وہ رندانہ نہیں

جانتا ہوں ، ہے آبیج میری ، یہ منزل کا خیال
چھوڑنا تھک کے سفر ، اندازِ مردانہ نہیں

ہر نفس اک تازہ جولانگاہ کرتا ہوں طلب
وہ نہ جب تک خود کہے اب کوئی ویرانہ نہیں

اس جنوں میں بھی مجھے پاسِ گریباں ھی رہا
اس طرح کا خود نگر ہر کوئی دیوانہ نہیں

۲۱

سوز وگدازِ زندگی لذتِ جستجوے تو
راه چو مار می گزد گر نروم بسوے تو

سینه کشاده جبرئیل از برِ عاشقان گزشت
تا شررے باو فتد زآتشِ آرزوے تو

هم بهوائے جلوهٔ پاره کنم حجاب را
هم بنگاهِ نارسا پرده کشم بروے تو

من بتلاشِ تو روم یا بتلاشِ خود روم
عقل و دل ونظر همه گم شدگانِ کوے تو

از چمنِ تو رسته‌ام قطرهٔ شبنمے به بخش
خاطر غنچه وا شود کم نشود ز جوے تو

۲۱

سوز و گدازِ زندگی ، لذتِ جستجو تری
ڈستی ہے راہ گر نہ ہو ، رہ مرے رو برو تری

سینہ کشادہ جبرئیل گزرا قرینِ عاشقاں
تا اسے بخشے اک شرر آتشِ آرزو تری

جلوے کی آرزو سے میں کرتا ہوں پارہ یہ حجاب
پر یہ نگاہِ نارسا ، خود ہے نقابِ رو تری

نکلوں تری تلاش میں یا کروں اپنی جستجو
عقل و دل و نظر مرے ہو گئے نذرِ کو تری

تیرے چمن کا پھول ہوں، قطرہ عطا ہو اوس کا
من کی کلی کھلے تو کیا ہو گی کم آب جو تری

درین محفل که کارِ او گزشت از باده و ساقی
ندیمے کو که در جامش فرو ریزم مۓ باقی!

کسے کو زهرِ شیریں می خورد از جام زرّینے
مۓ تلخ از سفالِ من کجا گیرد به تریاقی

شرار از خاکِ من خیزد کجا ریزم. کرا سوزم
غلط کردی که در جانم فگندی سوزِ مشتاقی

مکدر کرد مغرب چشمه هاے علم و عرفاں را
جهاں را تیره تر سازد چه مشّائی چه اشراقی

دلِ گیتی! انا المسموم انا المسموم، فریادش
خرد نالاں که ما عندی بتریاق ولا راقی

چه ملاّئی چه درویشی. چه سلطانی. چه دربانی
فروغِ کار می‌جوید بسالوسی و زرّاقی

ببازارے که چشم صیرفی شور است و کم نور است
نگینم خوار تر گردد چو افزاید به برّاقی

نہیں محفل کو کافی اہتمام بادہ و ساقی
کہاں ساتھی کہ جس کے جام میں بھر دوں مے باقی!

وہ جس نے پی لیا ہو زہر شیریں جام زریں سے
مری تلخِ سفالی سے ہو کیسے اس کی تریاقی

مرے تن سے شرر اٹھے، کہاں پھینکوں، کسے سونپوں
مری جاں کو دیا کیوں تو نے آخر سوزِ مشتاقی!

مکدّر کر دیے مغرب نے چشمے علم و عرفاں کے
جہاں تاریک تر اس سے ہو مشّائی[1] کہ اشراقی[2]

دلِ گیتی ہے فریادی، مجھے اس زہر نے مارا
خرد بولی، نہیں بس میں مرے تریاق اور راقی[3]

ہو مُلّائی کہ درویشی، ہو سلطانی کہ دربانی
فروغِ کار میں اس کے فریب و مکر و زرّاقی

جہاں بازار کے ناقد کی آنکھیں زار و کم بیں ہوں
نگیں اتنا ہی میرا خوار، جتنی اس کی برّاقی

(۱) ، (۲) - فلسفہ کے دو دبستان - مشائیت - اشراقیت
(۳) ساحر یا فسوں گر

۲۳

ساقیا بر جگرم شعلهٔ نمناک انداز
دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز

او بیک دانهٔ گندم بزمینم انداخت
تو بیک جرعهٔ آب آنسوے افلاک انداز

عشق را بادهٔ مرد افگن و پُر زور بده
لاے این باده به پیمانهٔ ادراک انداز

حکمت و فلسفه کرد است گران خیز مرا
خضرِ من! از سرم این بارِ گران پاک انداز

خرد از گرمیِ صهبا بگدازے نرسید
چارهٔ کار بآن غمزهٔ چالاک انداز

بزم در کشمکشِ بیم و امید است هنوز
همه را بے خبر از گردشِ افلاک انداز

می توان ریخت در آغوشِ خزان لاله و گل
خیز و بر شاخِ کهن خونِ رگِ تاک انداز

۲۳

پھر جگر پر مرے اک شعلۂ نمناک گرے
ساقی! آشوبِ قیامت بکفِ خاک گرے

اُس نے اک دانہ کے بدلے میں زمیں پر پھینکا
دے وہ جرعہ کہ یہ بندہ سرِ افلاک گرے

عشق کو دے مرے مرد افگن و تند و پُر زور
جو بھی تلچھٹ ہو، بہ پیمانۂ ادراک گرے

حکمت و فلسفہ نے مجھ کو گراں خیز کیا
خضرِ من! بار مرے سر سے سرِ خاک گرے

پا سکی عقل نہ کچھ گرمیِ بادہ سے گداز
بجلی بن کر وہ ترا غمزۂ چالاک گرے

بزم میں بیم و رجا کی ہیں ابھی تک گھاتیں
اب نہ اس پر اثرِ گردشِ افلاک گرے

ہو تو سکتے ہیں گل و لالہ خزاں میں پیدا
شاخِ کہنہ پہ اگر خونِ رگِ تاک گرے

۲۲

ازآں آبے که در من لاله کارد ساتگینے ده
کفِ خاکِ مرا ساقی ببادِ فرودینے ده

زمیناے که خوردم در فرنگ اندیشه تاریک است
سفر ورزیدهٔ خود را نگاهِ راه بینے ده

چو خس از موجِ هر بادے که می آید ز جا رفتم
دلِ من از گمانها در خروش آمد یقینے ده

خرام آرزوها بود و نابودِ شرر دارد
شبم را کوکبے از آرزوے دل نشینے ده

بدستم خامهٔ دادی که نقشِ خسروی بندد
رقم کش این چنینم کردهٔ لوحِ جبینے ده

آسی صہبا کا ساغر ہو جو دل کو لالہ کاری دے
اڑا لے جائے میری خاک، وہ بادِ بہاری دے

جو پی اقلیم مغرب میں ہوا تاریک فکر اس سے
نگہ دے اپنے راہی کو، سفر سے سازگاری دے

اڑاتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا مثلِ خس مجھ کو
پریشاں ہوں گمانوں سے، یقیں شُبہوں سے عاری دے

شرر صورت تمنائیں مرے دل سے گزرتی ہیں
مری شب کی جو کوکب ہو، تو اُس کو پایداری دے

دیا ہے مجھ کو وہ خامہ جو نقشِ خسروی کھینچے
کوئی لوحِ جبیں بھی اب برائے نقش کاری دے

ز هر نقشے که دل از دیده گیرد پاک می آیم
گدائے معنیٔ پاکم تہی ادراک می آیم

گہے رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد
من ار درسِ حرد منداں گریباں چاک می آیم!

گہے پیچد جہاں بر من گہے من بر جہاں پیچم
بگرداں باده تا بیروں ازیں پیچاک می‌آیم

نه ایں جا چشمکِ ساقی نه آنجا حرفِ مشتاقی
ر بزمِ صوفی و مُلاّ بسے غمناک می آیم

رسد وقتے که خاصانِ ترا با من فتد کارے
که من صحرائیم پیشِ ملک بے باک می آیم

۲۵

مٹایا نقش جو بھی آنکھ سے دل نے کبھی پایا
گدا ہوں پاکِ معنی کا، تہی ادراک میں آیا

کبھی ذوقِ جنوں اہلِ خرد کی دین ہوتا ہے
میں درسِ اہلِ دانش سے گریباں چاک کر لایا

کبھی مجھ سے جہاں لپٹا، جہاں سے میں کبھی لپٹا
میں اس چکر سے نکلوں گا جو بادہ دور میں آیا

نہیں یاں چشمکِ ساقی، نہیں واں حرفِ مشتاقی
مرا غم محفلِ صوفی و مُلاّ نے ہے بھڑکایا

وہ وقت آئے گا، تیرے خاص بندے مجھ کو ڈھونڈیں گے
کہ میں پیشِ ملک بے باک ہوں، صحرا کا ہوں جایا

۲۶

دلِ بے قیدِ من با نورِ ایماں کافری کرده
حرم را سجده آورده بتاں را چاکری کرده

متاعِ طاعتِ خود را ترازوے برافرازد
بازارِ قیامت با خدا سوداگری کرده

زمین و آسماں را بر مرادِ خویش می خواهد
غبارِ راه و با تقدیرِ یزداں داوری کرده

گهے با حق درآمیزد . گهے با حق درآویزد
زمانے حیدری کرده زمانے خیبری کرده

بایں بے رنگیٔ جوهر ازو نیرنگ می ریزد
کلیمے بیں که هم پیغمبری هم ساحری کرده

نگاهش عقلِ دور اندیش را ذوقِ جنوں داده
و لیکن با جنونِ فتنه ساماں نشتری کرده

خود کے می رسد ایں راه پیماے تن آسانے
هزاراں سال منزل در مقامِ آذری کرده!

۲٦

مرا بے قید دل مومن ھے ، اس نے کافری کی ھے
حرم میں سجدہ ریزی کی ، بتوں کی چاکری کی ھے

متاعِ بندگی لے کر ، بپا میزاں کیا اس نے
خدا سے حشر کے بازار میں سوداگری کی ھے

زمین و آسماں ھوں سازگار ، اس کی تمنا ھے
غبارِ راہ نے تقدیرِ حق سے داوری کی ھے

کبھی ھے حق سے مل بیٹھا ، کبھی حق سے الجھ بیٹھا
اسی نے حیدری کی ھے ، اسی نے خیبری کی ھے

یہ ھے بے رنگ جوھر میں ، یہ نیرنگی کا خالق ھے
کلیم ایسا ، پیمبر ھو کے جس نے ساحری کی ھے

فلک رس عقل کو اس کی نظر ذوقِ جنوں بخشے
جنونِ فتنہ ساماں کی بھی اس نے نشتری کی ھے

یہ تن آساں ھے راھی ، کیسے اپنے آپ تک پہنچے
ھزاروں سال تک اس نے مسلسل آذری کی ھے

۲۷

زِ شاعر نالهٔ مستانه در محشر چه می خواهی
تو خود هنگامهٔ، هنگامهٔ دیگر چه می‌خواهی

به بحرِ نغمه کردی آشنا طبعِ روانم را
زِ چاکِ سینه ام دریا طلب، گوهر چه می خواهی

نمازِ بے حضور از من نمی‌آید، نمی‌آید
دلے آورده ام دیگر ازیں کافر چه می خواهی

۲۷

فغاں مستانہ شاعر سے ، سرِ محشر تو کیوں چاہے
تو خود ھنگامہ ہے ، ھنگامۂ دیگر تو کیوں چاہے

مری طبعِ رواں کو بحرِ نغمہ کا کیا محرم
مرے سینہ سے کر دریا طلب ، گوھر تو کیوں چاہے

نمازِ بے حضور اور میں! یہ کیسے ہو، یہ کیسے ھو!
یہ کافر، دل تو لایا ہے ، دگر محضر تو کیوں چاہے

۲۸

نه در اندیشهٔ من کارزارِ کفر و ایمانے
نه در جانِ غم اندوزم، هوائے باغِ رضوانے

اگر کاوی درونم را خیالِ خویش را یابی
پریشان جلوهٔ چون ماهتاب اندر بیابانے!

۲۸

نہ میرے فکر کے میداں میں جنگِ کفرو ایماں ہے
نہ دل کے غم کدہ میں آرزوے باغِ رضواں ہے

مرا دل جو کریدو گے، خیال اپنا ھی پاؤ گے
پریشاں جلوہ جیسے چاندنی ہے اور بیاباں ہے

۲۹

مرغِ خوش لهجه و شاهینِ شکاری از تست
زندگی را روشِ نوری و ناری از تست

دلِ بیدار و کفِ خاک و تماشاے جهان
سیرِ این ماه بشب گونه عماری از تست

همه افکارِ من از تست چه در دل چه بلب
گهر از بحر برآری نه برآری از تست

من همان مشتِ غبارم که بجاے نرسد
لاله از تست و نم ابر بهاری از تست

نقش پردار توئی ما قلم افشانیم
حاضر آرائی و آینده نگاری از تست

گله ها داشتم از دل بزبانم نرسید
مهرو بے مهری و عیاری و یاری از تست

۲۹

مرغِ خوش لہجہ و شاہینِ شکاری تیرے
جینے کے ڈھنگ سبھی نوری و ناری تیرے

خاک کا پتلا ، دلِ زندہ ، تماشائے جہاں
سیر اس ماہ کی ، شب رنگ عماری تیرے

تیرے ہیں،دل میں کہ لب پر ہوں،سب افکار مرے
ہوں گہر بحر میں یا بر میں ہوں ساری، تیرے

میں وہی دھول کہ آوارہ رہی راہوں میں
گلِ لالہ و نمِ ابرِ بہاری تیرے

نقش پرداز ہے تو ، ہم قلمِ افشاں ہیں
زینت امروز کی اور فردا نگاری تیرے

دل سے شکوے تھے کئی ،لب پہ نہ آئے لیکن
مہر و بے مہری و عیاری و یاری تیرے

۳۰

خوشتر ز ہزار پارسائی
گامے بطریقِ آشنائی

در سینۂ من دمے بیاسائے
از محنت و کلفتِ جدائی

مارا ز مقامِ ما خبر کن
مائیم کجاؤ تو کجائی؟

آں چشمکِ محرمانہ یاد آر
تا کے بتغافل آزمائی

دی ماہِ تمام گفت با من
در سازِ بداغِ نارسائی

خوش گفت ولے حرام کردند
در مذہبِ عاشقاں جدائی

پیشِ تو نہادہ ام دلِ خویش
شاید کہ تو ایں گرہ کشائی!

۳۰

خوب تر ہے ہزار پارسائی سے
اک قدم بھی طریقِ آشنائی سے

میرے سینے میں آکے دم ذرا لے لو
لگی ہیں کلفتیں بہت خدائی سے

ہم کو اپنے مقام کی خبر تو دے
کتنے ہم ہیں پرے تری رسائی سے

پھر وہی تیری محرمانہ چشمک ہو
کام کب تک تغافل آزمائی سے

میرے ماہِ تمام نے کل یہ کہا
ہو نہ دل تنگ داغِ نارسائی سے

بات تو خوب کی ہے مگر ہے حرام
عاشقوں کو مصالحت جدائی سے

میں نے دل کھول کر تجھے دکھایا ہے
حل ہو مشکل، تری گرہ کشائی سے

۳۱

بر جهانِ دلِ من تاختنش را نگرید
کشتن و سوختن و ساختنش را نگرید

روشن از پرتوِ آن ماه دلے نیست که نیست
با هزار آئینه پرداختنش را نگرید

آنکه یکدست برد ملکِ سلیمانے چند
با فقیران دو جهان باختنش را نگرید

آنکه شبخون بدل و دیدهٔ دانایان ریخت
پیشِ نادان سپر انداختنش را نگرید

۳۱

کرتا دل پر ترکتازی کیسے آیا، دیکھیے
خود ہی مارا، خود جلایا، خود جِلایا دیکھیے

اس مہِ کامل کا پرتو کون سے دل پر نہیں
ہے ہزار آئینوں میں محوِ تماشا دیکھیے

جس نے سو ملکِ سلیماں سر کیے اک وار میں
اک گدا کو دوجہاں دے بے تقاضا دیکھیے

مارے شبخوں جس نے داناؤں کی چشم و قلب پر
ایک ناداں سے وہ ہارے، یہ اچنبھا دیکھیے

مرا براهِ طلب بار در گل است هنوز
که دل بقافله و رخت و مرل است هنوز

کجاست برقِ نگاهے که خانماں سوزد!
مرا معامله با کشت و حاصل است هنوز

یکے سفینهٔ ایں خام را بطوفاں ده
ر ترسِ موج نگاهم بساحل است هنوز

تپیدن و ترسیدن چه عالمے دارد
خوشا کسے که بدنبالِ محمل است هنوز

کسی که ار دو جهاں خویس را بروں نشاخت
فریب خوردهٔ ایں نقشِ باطل است هنوز

نگاهِ شوق تسلی بجلوهٔ نشود
کجا برم خلشے را که در دل است هنوز

حضورِ یار حکایت درارتر گردید
چنانکه ایں همه ناگفته در دل است هنوز

۳۲

ابھی راہ طلب میں ہے مرا بارِ سفر، گِل میں
کہ اب تک ہے مرا دل قافلہ و رخت و منزل میں

کہاں ہیں وہ نظر کی بجلیاں جو خانماں پھونکیں
مرا سب کام الجھا ہے ابھی تک کشت و حاصل میں

ذرا مجھ خام کی کشتی کو طوفاں آشنا کردے
کہ خوفِ موج سے میری نظر اٹکی ہے ساحل میں

تپش ہو، نارسائی ہو، اسی میں ایک عالم ہے
وہی خوش بخت ہے جو ہو رواں دنبالِ محمل میں

دو عالم سے پرے جس نے نہ اپنے آپ کو جانا
گھری ہے اُس کی ذات اب تک فریبِ نقشِ باطل میں

نگاہِ شوق کی تسکیں کو اک جلوہ نہیں کافی
خلش کا کیا کروں جو ہے نہاں اب تک مرے دل میں!

حکایت ہو گئی لمبی حضورِ یار کچھ ایسے
کہ جو کہنے کی باتیں تھیں، ہیں نا گفتہ ابھی دل میں!

۳۳

زمستان را سرآمد روزگاران
نواها زنده شد در شاخساران

گلان را رنگ و نم بخشد هواها
که می‌آید ز طرفِ جوئباران

چراغِ لاله اندر دشت و صحرا
شود روشن‌تر از بادِ بهاران

دلم افسرده تر در صحبتِ گل
گریزد این غزال از مرغزاران!

دمے آسوده با درد و غم خویش
دمے نالان چو جوے کہساران

ز بیم اینکه ذوقش کم نگردد
نگویم حالِ دل با رازداران!

۳۳

زمستاں کا سماں بدلا بہاروں سے
نوائیں جاگ اٹھی ہیں شاخساروں سے

گلوں کو رنگ و نم بخشا ہواؤں نے
جو آئی ہیں لہکتی جوئیباروں سے

چراغِ لالہ صحرا میں بھڑک اٹھے
نسیم آئی لیے سندیسہ یاروں سے

مرا دل صحبتِ گل میں فسردہ تر
گریزاں ہے یہ آہو مرغزاروں سے

ابھی پہلو میں درد و غم کے آسودہ
ابھی نالاں ہے مل کر آبشاروں سے

مبادا ذوق اس کا ہو نہ جائے کم
چھپایا حالِ دل ہے رازداروں سے

۳۴

هوائے خانه و منزل ندارم
سرِ راهم غریبِ هر دیارم

سحر می گفت خاکستر صبا را
«فسرد از بادِ این صحرا شرارم

گذر نرمک پریشانم مگردان
ز سوزِ کاروانے یادگارم»

ز چشمم اشک چون شبنم فروریخت
که من هم خاکم و در رهگذارم!

بگوشِ من رسید از دل سرودے
که جوئے روزگار از چشمه سارم

ازل تاب و تبِ پیشینهٔ من
ابد از ذوق و شوقِ انتظارم

میندیش از کفِ خاکے میندیش
بجانِ تو که من پایان ندارم!

۳۴

منزل سے کچھ غرض ہے نہ مشتاقِ دار* ہوں
راہی ہوں ہر کہیں میں غریب‌الدیار ہوں

کہتی تھی راکھ باد صبا سے یہ صبح دم
«اس دشت کی ہوا سے فسردہ شرار ہوں

آہستہ کر خرام، پریشاں نہ کر مجھے
اک کارواں کے سوز کی میں یادگار ہوں»

شبنم کی طرح ٹپکے ہیں آنکھوں سے میرے اشک
مشتِ غبار ہوں میں سرِ رہگزار ہوں!

آئی ہے میرے کان میں گاتی صدائے دل
جو اصلِ جوئے دھر ہے۔وہ چشمہ سار ہوں

ماضی میں میری ہی تو تڑپ کا ازل ہے نام
ہے یہ ابد کہ میں سراسر انتظار ہوں

کر مشت خاک کی نہ کوئی فکر زینہار
مجھ کو تری قسم ہے کہ میں بے کنار ہوں!

* دار بمعنی گھر

۳۵

از چشمِ ساقی مستِ شرابم
بے مے خرابم، بے مے خرابم

شوقم فزون تر از بے حجابی
بینم نہ بینم در پیچ و تابم

چون رشتۂ شمع آتش بگیرد
از زخمۂ من تار ربابم!

از من برون نیست منزلگہ من
من بے نصیبم راہے نیابم!

تا آفتابے خیزد ز خاور
مانندِ انجم بستند خوابم!

۳۵

بس اے چشمِ ساقی ہوا میں شرابی
یہ بے مے خرابی ! یہ بے مے خرابی !

جو بے پردہ دیکھا بڑھا شوق میرا
میں دیکھوں نہ دیکھوں ، وہی پیچ[1] وتابی

ہے جُوں رشتۂ شمع ، جل جل اٹھا ہے
مرے زخمہ سے میرا تارِ ربابی !

نہیں مجھ سے باہر کوئی میری منزل
مری بے نصیبی ، نہیں راہ یابی

نہ خورشید نکلیگا خاور سے جب تک
جُوں انجم رہیگی میری بستہ خوابی[2] !

۱- ادنٰی تصرف کے ساتھ
۲- بستہ خوابی بمعنی بے خوابی

٣٦

شب من سحر نمودی که به طلعت آفتابی
تو بطلعت آفتابی سزد ایں که بے حجابی

تو بدردِ من رسیدی بضمیرم آرمیدی
ز نگاهِ من رمیدی بچنیں گراں رکابی

تو عیارِ کم عیاراں تو قرارِ بے قراراں
تو دوائے دل‌فگاراں مگر ایں که دیریابی

غمِ عشق و لذتِ او اثرِ دو گونه دارد
گہے سوز و دردمندی گہے مستی و خرابی!

ز حکایتِ دلِ من تو بگو که خوب دانی
دلِ من کجا که او را بکنارِ من نیابی!

بجلالِ تو که در دل دگر آرزو ندارم
بجز ایں دعا که بخشی بکبوتراں عقابی!

مری شب سحر ہے، چمکی تری طلعت آفتابی
ترے رخ پہ مہر طلعت سجی خوب بے حجابی

مرے درد کی دوا تو، مرے دل میں آ بسا تو
پہ چھپا نظر سے کیونکر لیے یہ گراں رکابی

تو عیارِ کم عیاراں۔ تو قرارِ بے قراراں
تو دوائے دلفگاراں۔ تو یہ کیسی دیریابی

غم عشق میں ہے لذت مگر اس کے رنگ دو ہیں
کبھی سوز و دردمندی کبھی مستی و خرابی!

تجھے علم ہے۔ بیاں کر۔ مرے دل کی خود حکایت
مرے دل کی میرے پہلو میں نہ ہو گی دستیابی

بجلالِ تو کہ دل میں یہی ایک آرزو ہے
کہ ملے کبوتروں کو ترے لطف سے عقابی!

۳۷

زیں میخانه اے ساقی ندارم محرمے دیگر
که من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر!

دمے ایں پیکرِ فرسوده را سازی کفِ خاکے
فشانی آب و از خاک آتش انگیزی دمے دیگر!

بیار آں دولتِ بیدار و آں جامِ جہاں بیں را
عجم را دادهٔ ہنگامهٔ بزمِ جمے دیگر

نہیں ساقی نشاں اس میکدہ میں ایک محرم کا
کہ میں شاید ہوں پہلا آدمی اک اور عالم کا!

کبھی اس کہنہ پیکر کو تو مشتِ خاک کرتا ہے
کبھی مٹی ہے آتش خیز پا کر رس ترے نم کا!

ہم پھر دولتِ بیدار اور جامِ جہاں بیں ہو
دیا ہے تو نے ہنگامہ عجم کو محفلِ جم کا

به جهانِ دردمندان تو بگوچه کارداری؟
ب و تابِ ما شناسی؟ دلِ بے قرار داری؟

چه خبر ترا ز اشکے که فرو چکد ز چشمے
تو به برگِ گل ز شبنم درِ شاهوار داری!

چه بگویمت ز جانے که نفس نفس شمارد
دمِ مستعار داری؟ غمِ روزگار داری؟

یہ جہانِ درد منداں نہیں کاروبار تیرا
نہیں تاب و تب کا محرم، دلِ بے قرار تیرا

تجھے کیا خبر کہ کیا ہے جو سرشک بن کے ٹپکا
بنی برگِ گل پہ شبنم دُرِ شاہوار تیرا!

کہوں حال کیا میں جاں کا، ہے نفس شمار ہر دم
دمِ مستعار تیرا؟ غمِ روزگار تیرا؟

۳۹

اگر نظاره از خود رفتگی آرد حجاب اولے
بگیرد با من این سودا بہا ار بس گران خواهی

سخن بے پردہ گوبا ما ؛ شد آں روزِ کم آمیزی
که می گفتند تو ما را چنیں خواهی چناں خواهی

نگاہِ بے ادب زد رخنه ها در چرخِ مینائی
دگر عالم بنا کن گر حجابے درمیاں خواهی

چناں خود را نگه داری که با این بے نیازی ها
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواهی!

مقامِ بندگی دیگر ، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجده می خواهی ز خاکی بیش ازاں خواهی!

مِسِ خامے که دارم از محبت کیمیا سازم
که فردا چوں رسم پیشِ تو از من ارمغاں خواهی

۳۹

جو بے خود کر دے نظارا تو جلوہ سے حجاب اچھا
نہیں کرتا میں یہ سودا کہ تو قیمت گراں چاہے

سخن کہہ ہم سے بے پردہ ، گیا دورِ کم آمیزی
جب اوروں سے تجھے سنتے ، تو چنیں چاہے چناں چاہے

نگاہِ بے ادب سے چرخِ مینائی میں رخنے ھیں
نیا عالم بنا گر تو حجاب اک درمیاں چاہے

یہ تیری بے نیازی اور یہ تیری خود نگہداری
شہادت اپنے ہونے کی ، بخونِ دوستاں چاہے!

مقامِ بندگی سے ہے مقامِ عاشقی برتر
تو چاہے سجدہ نوری سے مگر خاکی سے جاں چاہے!

بنالونگا مسِ خام اپنا میں اکسیر الفت سے
کہ شاید مجھ سے تو روزِ قیامت ارمغاں چاہے!

۴۰

نورِ تو وا نمود سپید و سیاه را
دریا و کوه و دشت و در و مہر و ماه را!

تو در ہوائے آں کہ نگہ آشنائے اوست
من در تلاشِ آں کہ نتابد نگاه را!

۴۰

کاشف ہے تیرا نور ، سپید و سیاہ کا
دریا و دشت و کوہ و در و مہر و ماہ کا

تو چاھتا ہے جس سے نگاھیں ھوں آشنا
اور میں ، سہے نہ بار جو تابِ نگاہ کا

بده آں که دل مستی هاے او از بادۀ خویش است
بگیر ایں دل که ار خود رفته و بیگانه اندیش است

بده آں دل بده آں دل که گیتی را فرا گیرد
بگیر ایں دل بگیر ایں دل که در بندِ کم و بیش است

مرا اے صید گیر از ترکشِ تقدیر بیروں کش
جگر دوزی چه می آید ازاں تیرے که در کیش است!

نگردد زندگانی خسته از کارِ جہاں گیری
جہانے در گرہ بستم جہانے دیگرے پیش است!

وہ دل دے مستیوں میں جس کی جھلکے اپنی ھی صہبا
یہ دل کیا جو ہے بے خود اور فکرِ غیر کا شیدا

ملے وہ دل ، ملے وہ دل ، مسخّر جو کرے گیتی
یہ دل لیے لیے ، یہ دل لیے لیے ، جو بیش و کم میں ہے الجھا

مجھے صیاد کھینچے ترکشِ تقدیر سے باھر
نہ اترے گا جگر میں تیر ، نہ ترکش سے گر نکلا!

نہیں کارِ جہانگیری سے ھوتی زندگی خستہ
جو کی تسخیر یہ دنیا ، ابھی ہے دوسری دنیا!

کفِ خاک برگ و سازم برہے فشانم او را
بامیدِ این که روزے بفلک رسانم او را

چه کنم چه چاره گیرم که ز شاخِ علم و دانش
نه دمیده هیچ خارے که بدل نشانم او را

دهد آتشِ جدائی شررِ مرا نمودے
به همان نفس بمیرم که فرونشانم او را

مئے عشق و مستیٔ او برود برون ز خونم
که دلِ آنچنان ندادم که دگر ستانم او را

تو بلوحِ سادهٔ من همه مدعا نوشتی
دگر آنچنان ادب کن که غلط نخوانم او را

حضورِ تو اگر کس غزلے ز من سراید
چه شود اگر نوازی به همیں که 'دانم او را'

کفِ خاک ہے اثاثہ ، سرِرہ اڑا رہا ہوں
اس امید پر کہ اک دن کہوں میں فلک رسا ہوں

مرا چارہ کیا ہے آخر ، سرِ شاخِ علم و دانش
نہ اُگا وہ ایک کانٹا جسے دل میں رکھ سکا ہوں

کیا آتشِ جدائی نے مرا شرر آجاگر
کہ جو بجھ گیا تو سمجھو کہ میں مردہ ہو چکا ہوں

مِرے عشق اور اُس کی مستی رہے مرے خوں میں ساری
نہ میں لونگا دل کو واپس کہ میں پیکرِ وفا ہوں

مری لوحِ سادہ پر جو ترا مدعا رقم ہے
دے وہ تربیت ، زباں سے نہ کبھی غلط سرا ہوں

جو ترے حضور کوئی مری اک غزل سنائے
تو کرم ہو تُو جو کہہ دے کہ 'میں اس سے آشنا ہوں

۴۳

این دل که مرا دادی لبریزِ یقین بادا
این جامِ جهان بینم روشن تر ازین بادا

تلخے که فرو ریزد گردون بسفالِ من
در کامِ کهن رندے آنهم شکرین بادا

دل تو نے دیا اس کو لبریزِ یقیں کر دے
اِس جامِ جہاں بیں کو کچھ اور حسیں کر دے

وہ تلخ جو گردوں نے کاسہ میں مرے بھر دی
رند اپنے کا دل رکھ لے ، اس کو شکریں کر دے

رمزِ عشقِ تو به اربابِ هوس نتوان گفت
سخن از تاب و تبِ شعله به خس نتوان گفت

تو مرا ذوقِ بیان دادی و گفتی که بگوے
هست در سینهٔ من آنچه بکس نتوان گفت!

از نهان خانهٔ دل خوش غزلے می خیزد
سرِ شاخے همه گویم به قفس نتوان گفت

شوق اگر زندهٔ جاوید نباشد عجب است
که حدیثِ تو درین یک دو نفس نتوان گفت!

۴۴

رمز تیرے عشق کی اہلِ ہوس سے کیا کہوں
تابشِ شعلہ کی باتیں، خار و خس سے کیا کہوں

تو نے فرمایا ، کہو ، دے کر مجھے ذوق بیاں
جو مرے سینے میں ہے نا کس سے، کس سے کیا کہوں

دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے طرب افزا غزل
شاخ پر سے کہتا ہوں ، کنجِ قفس سے کیا کہوں

یہ عجب تھا ، زندۂ جاوید گر ہوتا نہ شوق
بات تیری ، عارضی سے اس نفس سے کیا کہوں

۴۵

یادِ ایاّ میکه خوردم باده ها با چنگ و نے
جامِ مے در دستِ من ، مینائے مے در دستِ وے!

در کنار آئی خزانِ ما زند رنگِ بہار
ورنیائی فرو دیں افسرده تر گردد ز دے!

نے نو جانِ من چو آں سازے که تارش در گسست
در حضور از سینهٔ من نغمه خیزد پے به پے

آنچه من در بزمِ شوق آورده ام دانی که چیست
یک چمن گل ، یک نیستاں ناله ، یک خمخانه مے!

زنده کن باز آں محبت را که از نیروئے او
بوریائے ره نشینے درفتد باتختِ کے!

دوستاں حرّم که بر منزل رسید آوارهٔ
من پریشاں جاده هائے علم و دانش کرده طے!

یاد ہیں وہ دن کہ پیتا تھا بہ صوتِ چنگ و نے
دوست کے ہاتھوں میں مینا ، کف پہ میرے جامِ مے

تو ہو پہلو میں تو رنگیں ہو خزاں مثلِ بہار
گر نہ ہو ، دے سے فسردہ تر بہاراں کی ہے لے

میری جاں سازِ شکستہ تار ہے تیرے بغیر
پاس جو تو ہو ، اٹھیں سینہ سے نغمے پے بہ پے

جانتا ہے تو کہ بزمِ شوق میں لایا ہوں کیا؟
اک چمن گل ، اک نیستاں نالہ ، اک خمخانہ مے!

زندہ کر پھر وہ محبت جس کی قوت کے طفیل
بوریا اک رہ نشیں کا ہو حریفِ تختِ کے

دوست شاداں ہیں کہ منزل مل گئی آوارہ کو
میں پریشاں ، جادہ ہائے علم و دانش کر کے طے!

۴۶

انجم بگریبان ریخت این دیدهٔ تر ما را
بیرون ز سپهر انداخت این ذوقِ نظر ما را

هر چند زمین سائیم بر تر ز ثریا ئیم
دانی که نمی زیبد عمرے چو شرر ما را

شام و سحرِ عالم از گردشِ ما خیزد
دانی که نمی سازد این شام و سحر ما را

این شیشهٔ گردون را از باده تهی کردیم
کم کاسه مشو ساقی! مینائے دگر ما را

شایانِ جنونِ ما پهنائے دو گیتی نیست
این رهگزر ما را آن رهگزر ما را!

۴۶

انجم مرے دامن کو ملے دیدۂ تر سے
گزرا حدِ افلاک سے میں ذوقِ نظر سے

ہر چند زمیں ہوں، ثریا سے ہوں برتر
تسکیں نہیں ہو سکتی مری عمرِ شرر سے

یہ شام و سحر ہیں مری گردش کا نتیجہ
اپنی نہ کبھی بجھ سکی اس شام و سحر سے

صہبا سے کیا میں نے تہی شیشۂ گردوں
ساقی نہ ہو خِسّت، ملے مینائے دگر سے

شایاں مرے سودا کے نہیں دشتِ دو عالم
آتے ہیں نظر دونوں مجھے راہگزر سے

حاور که آسماں بہ کمندِ خیالِ اوست
ار حویتش گسسته و بے سوزِ آرزوست

در تیره خاکِ او تب و تابِ حیات نیست
جولانِ موج را نگراں ار کنارِ جوست!

تبخانه و حرم همه افسرده آتشے
پیرِ مغاں شرابِ ہوا خورده در سبوست

فکرِ فرنگ پیشِ مجاز آورد سجود
بینائے کور و مستِ تماشائے رنگ و بوست!

گردنده تر ز چرخ و رباینده تر ز مرگ
ار دستِ او بدامنِ ما چاکِ بے رفوست!

خاکی نہاد و حو ز سپہرِ کہن گرفت
عیار و بے مدار و کلاں کار و تو بتوست!

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مرده و بے ذوقِ جستجوست!

ساقی بیار باده و بزمِ شبانه ساز
ما را حرابِ یک نگهِ محرمانه ساز

مشرق کہ ہے بلند خیالی سے سُرخ رُو
بیگانہ اپنے آپ سے ، بے سوزِ آرزو
مٹی میں اس کی تاب و تبِ زندگی نہیں
جولانِ موج کا ہوا ناظر کنارِ جُو

بتخانہ و حرم کی فسردہ ہوئی ہے آگ
بے کیف مے سے ، پیرِ مغاں کا ہے پُر سبو
فکرِ فرنگ کرتی ہے سجدہ مجاز کو
بینائے کور! مستِ تماشائے رنگ و بُو!

گردش میں چرخ سے سوا ، مہلک ہے مرگ سے
دامن کا چاک اپنا اسی سے ہے بے رفو
عیار و بے مدار و کلاں کار و پیچ پیچ
خا کی نہاد ، اور ہے پیرِ فلک کی خو

مشرق خراب ہو چکا ، مغرب خراب تر
عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو
لا بادہ ساقی ، زینتِ بزمِ شبانہ کر
کر مستیاں عطا ، نگہ محرمانہ کر

فرصتِ کشمکش مده این دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیاده کن گیسوۓ تابدار را

از تو درونِ سینه ام برق تجلّیٔ که من
با مه و مهر داده ام تلخیٔ انتظار را

ذوقِ حضور در جهان رسمِ صنم گری نهاد
عشق فریب می دهد جانِ امیدوار را

تا بفراغِ خاطرے نغمهٔ تازهٔ زنم
بار به مرغزار ده طائرِ مرغزار را

طبعِ بلند دادهٔ ، بند ز پاۓ من کشاۓ
تا به پلاسِ تو دهم خلعتِ شهریار را

تیشه اگر بسنگ زد این چه مقامِ گفتگو است
عشق بدوش می کشد این همه کوهسار را!

۴۸

فرصتِ کشمکش نہ دے اس دلِ بے قرار کو
اور بھی تابدار کر گیسوے تابدار کو

سینے میں تیرے جلوے کی بجلیاں نور پاش ہیں
حیراں ہیں مہر و ماہ لیے تلخیٔ انتظار کو

ذوقِ حضور سے پڑی دنیا میں رسمِ بتگری
دیتا رہا فریب عشق جانِ امیدوار کو

تا کہ وہ نغمہ گا سکوں جس سے فراغِ دل ملے
پھر وہی مرغزار دے طائرِ مرغزار کو

طبعِ بلند کی عطا ، کھول دے میرے بندِ پا
بدلوں برے پلاس سے خلعتِ شہر یار کو

سنگ پہ تیشہ زن ہوا ، کیا ہے مقامِ گفتگو
عشق تو دوش پر لیے پھرتا ہے کہسار کو!

جانم در آویخت با روزگاران
جوئے است نالان در کوهساران!

پیدا ستیزد ، پنهان ستیزد
نا پایدارے با پایداران!

این کوه و صحرا این دشت و دریا
نے رازداران نے غمگساران

بیگانهٔ شوق ! بیگانهٔ شوق !
این جوئباران این آبشاران

فریاد بے سوز ! فریاد بے سوز !
بانگِ هزاران در شاخساران

داغے که سوزد در سینهٔ من
آن داغ کم سوخت در لاله زاران!

محفل ندارد ساقی ندارد
تلخے که سازد با بے قراران!

مری جاں الجھتی ہے با روزگاراں
ہے نالاں ندی در برِ کوھساراں!

عجب رن پڑا ہے ، عیاں بھی ، نہاں بھی
کہ فانی الجھتا ہے با پائیداراں

یہ کہسار و صحرا ، یہ دشت اور دریا
نہ یہ رازداراں ۔ نہ یہ غمگساراں

تری شوق سے یہ ، تری شوق سے وہ
وہ ہوں جوئباراں کہ ہوں آبشاراں

ہے فریاد بے سوز ! فریاد بے سوز!
سنی شاخساروں سے بانگِ ہزاراں

مرے سینہ میں داغ جو جل رہا ہے
دکھائیں تو ایسا کوئی لالہ زاراں!

نہیں رکھتی محفل ، نہیں رکھتا ساقی
وہ مے جس سے شاداں رہیں بے قراراں!

۵۰

به تسلّی که دادی نگزاشت کارِ خود را
تبِ و تاب می سپارم دلِ بیقرارِ خود را

چه دلے که محنتِ او ز نفس شمارئ او
که بدستِ خود ندارد رگِ روزگارِ خود را

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمانی
بکنارهٔ برفگندی دُرِ آب دارِ خود را

مه و انجم از تو دارد گله ها ، شنیده باشی
که بخاکِ تیرهٔ ما زدهٔ شرارِ خود را

خلشے بسینهٔ ما ز خدنگِ او غنیمت!
که اگر بپائش افتد نبرد شکارِ خود را

۵۰

نہیں چلتا اس تسلی پہ یہ کاروبار اپنا
تجھے کر رہا ہوں واپس دلِ بے قرار اپنا

مرے دل کو غم یہ کھائے، ہے نفس شمار پیہم
کہ نہیں ہے اس کے ہاتھوں میں نظامِ کارِ اپنا

میں رہے ضمیر میں تھا، تری خود نمائیوں نے
پرے اک طرف کو پھینکا دُرِ آبدار اپنا

گِلے تو نے ماہ و انجم کے سُنے تو ہونگے شاید
مری خاک کو جو تو نے دیا ہے شرار اپنا

خلش اُس کے تیر کی ہے مرے سینے میں غنیمت
نہ اٹھائے پیشِ پا سے جو گِرا شکار اپنا

۵۱

حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

ز مشتاقاں اگر تابِ سخن بردی نمیدانی
محبت می کند گویا نگاہِ بے زبانے را!

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند
کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را!

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من
بایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را!

من اے دریائے بے پایاں بہ موجِ تو در افتادم
نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

ازاں معنی کہ چوں شبنم بجانِ من فرو ریزی
جہانے تازہ پیدا کردہ ام عرضِ فغانے را

۵۱

بیاں کا حرف اک کافی تمنائے جہاں کو
مرے ذوقِ حضوری نے بڑھایا داستاں کو

سخن کی تاب چھینی تو نے مشتاقوں سے، پھر کیا
محبت گویا کرتی ہے نگاہِ بے زباں کو!

کہاں وہ نور جو جز قاصدی جانے نہ کچھ بھی
کہاں وہ خاک جو آغوش میں لے آسماں کو!

مرے پیکر سے تاب و تب جو اک ذرہ بھی کم ہو
نہ اس قیمت پہ لُوں ہر گز حیاتِ جاوداں کو!

میں اے دریائے بے پایاں گِرا موجوں میں تیری
نہ مجھ کو چاہئیے گوہر، نہ ڈھونڈوں میں کراں کو

جو معنی تو نے برسائے جُوں شبنم جاں پہ، اُن سے
بنایا میں نے اک تازہ جہاں عرضِ فغاں کو

۵۲

چند روئے خودکشی پردهٔ صبح و شام را
چهره‌کشا تمام کن جلوهٔ نا تمام را

سوز و گداز حالتے است! باده ز من طلب کنی
پیش تو گر بیان کنم مستیٔ این مقام را!

من بسرود زندگی آتش او فزوده ام
تو هم بسیمے بده لالهٔ تشنه کام را

عقل ورق ورق بگشت عشق به نکتهٔ رسید
طائر زیرکے برد دانهٔ زیر دام را

نغمه کجا و من کجا ساز سخن بهانه ایست
سوے قطار می کشم ناقهٔ بے زمام را!

وقت برهنه گفتن است من به کنایه گفته ام
خود تو بگو کجا برم هم نفسان خام را!

۵۲

کب تک رکھیگا رُخ پہ تو پردۂ صبح و شام کو
چہرہ دکھا ، تمام کر جلوۂ نا تمام کو

سوز و گداز ہے وہ حال ، مجھ سے تُو میرے طلب کرے
ظاہر کروں جو تجھ پہ میں مستی کے اس مقام کو!

میرے سرودِ درد سے اور بھی بھڑکی آس کی آگ
اوس سے ہو عطائے نم لالۂ تشنہ کام کو

گھومی خرد ورق ورق ، عشق نے نکتہ پا لیا
طائر ذکی تھا ، لے گیا دانۂ زیرِ دام کو

نغمہ کجا ہے میں کجا ، سازِ سخن بہانہ ہے
لاتا ہوں پھر قطار میں ناقۂ بے زمام کو!

وقت تھا کہتا واشگاف ، میں نے کنائے سے کہا
تو ہی بتا کروں میں کیا ہم نفسانِ خام کو!

٥٣

نفس شمار به پیچاکِ روزگارِ خودیم
مثالِ بحر خروشیم و در کنارِ خودیم

اگرچه سطوتِ دریا امان به کس ندهد
بخلوتِ صدفِ او نگاهدارِ خودیم

ز جوهرے که نهان است در طبیعتِ ما
مپرس صیرفیان را که ما عیارِ خودیم

نه از خزانهٔ ما کس خراج می خواهد
بسرِ راه نشینیم و شهریارِ خودیم

درونِ سینهٔ ما دیگرے! چه بوالعجبی است!
کرا خبر که توئی یا که ما دوچارِ خودیم!

کشائے پرده ز تقدیرِ آدمِ خاکی
که ما به رهگذرِ تو در انتظارِ خودیم!

نفس شمار و گرفتارِ روزگار ہیں ہم
مثال بحر خروشاں سرِ کنار ہیں ہم

نہیں ہے سطوتِ دریا سے گو کسی کو اماں
صدف کے گوشے میں . اپنے نگاہدار ہیں ہم

ہمارے جوہرِ فطرت کو سمجھے کیا صرّاف
مصافِ دہر میں خود اپنا ہی عیار ہیں ہم

نہیں ہمارے خرانے سے لیتا کوئی خراج
فقیرِ راہ نشیں اور شہریار ہیں ہم

ہمارے سینہ میں ہو کوئی دوسرا ، ہے عجب
نہ جانے ُتو ہے کہ خود اپنے سے دوچار ہیں ہم

ہٹا دے پردۂ تقدیرِ آدمِ خاکی
خود اپنے منتظر اثنائے رہگذار ہیں ہم

۵۴

نه فغان به لب گشودم که فغان اثر ندارد
غمِ دل نگفته بهتر همه کس جگر ندارد

چه حرم چه دیر هر جا سخنی ز آشنائی!
مگر این که کس ز رازِ من و تو خبر ندارد!

چه ندیدنی است اینجا که شرر جهانِ ما را
نفسی نگاه دارد نفسی دگر ندارد!

تو ز راهِ دیدهٔ ما بضمیرِ ما گزشتی
مگر آنچنان گزشتی که نگه خبر ندارد!

کس ازین نگین شناسان نگذشت بر نگینم
بتو می سپارم او را که جهان نظر ندارد

قدحِ خرد فروزی که فرنگ داد ما را
همه آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد!

کیجے فغاں تو کس لیے ، نالہ میں جب اثر نہیں
کیا ہو بیانِ دردِ دل ، ہر کوئی ذی جگر نہیں

کعبہ کی ہو کہ دیر کی ، بات ہے آشنائی کی!
راز ہے تیرا میرا کیا ۔ کوئی بھی با خبر نہیں!

دیکھی جو تھی نہ دیکھنی ، میرے جہان کا شرر
آتا ہے ایک دم نظر ، پیدا دمِ دگر نہیں!

آنکھ کے راستے سے تُو دل میں مرے اتر گیا
لیکن کچھ اس طرح کہ خود آنکھ کو بھی خبر نہیں!

چل دے ماہرِ نگیں ۔ میرے نگیں کو چھوڑ کر
تجھ کو میں کیوں نہ سونپ دوں ، دنیا تو دیدہ ور نہیں

پایا ہے جو فرنگ سے جام ، خرد فروز ہے
گو ہمہ آفتاب ہے پر وہ سحر اثر نہیں!

۵۵

ما که افتاده تر از پرتوِ مه آمده ایم
کس چه داند که چساں ایں همه ره آمده ایم

با رقیباں سخن از دردِ دلِ ما گفتی
شرمسار از اثرِ ناله و آه آمده ایم

پرده از چهره بر افگن که چو خورشیدِ سحر
بهرِ دیدارِ تو لبریزِ نگه آمده ایم

عزمِ ما را به یقیں پخته ترک ساز که ما
اندریں معرکه بے خیل و سپه آمده ایم

تو ندانی که نگاہے سرِ راہے چه کند
در حضورِ تو دعا گفته بره آمده ایم

۵۵

افتادگی میں بڑھ گئے ہم عکسِ ماہ سے
کس کو خبر کہ آئے ہیں ہم کیسی راہ سے

یوں تیرے میرے درد کی باتیں ہوں غیر سے!
شرمندہ ہم ہیں اپنی فغاں، اپنی آہ سے

پردہ ہٹا کہ دید کو خورشید وار ہم
دامانِ دیدہ لائے ہیں بھر کر نگاہ سے

کر دے ہمارے عزم کو راسخ یقین سے
آئے ہیں رن میں عاری ہیں خیل و سپاہ سے

جانے تو کیا نگاہِ سرِ راہ کا اثر
تجھ کو دعائیں دے کے ہم آئے ہیں راہ سے!

اے خدائے مهر و مه خاکِ پریشانے نگر
ذرۀ در خود فرو پیچد بیابانے نگر

حسنِ بے پایان درونِ سینۀ خلوت گرفت
آفتابِ خویش را زیرِ گریبانے نگر!

بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را
آتشِ خود را بآغوشِ نیستانے نگر!

شوید از دامانِ هستی داغهائے کهنه را
سخت کوشی هائے این آلوده دامانے نگر!

خاکِ ما خیزد که سازد آسمانے دیگرے
ذرۀ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

اے خدائے مہر و ماہ ، خاکِ پریشاں دیکھ لے
ذرّہ نے خود میں سمویا ہے بیاباں دیکھ لے!

حسنِ بے پایاں ہوا اک سینہ میں خلوت گزیں
آفتاب اپنا نہاں زیرِ گریباں دیکھ لے!

قلبِ آدم کو عطا کیں عشق کی بے تابیاں
اپنی آتش کو بآغوشِ نیستاں دیکھ لے!

داغِ کہنہ دامنِ ہستی سے ہے یہ دھو رہا
کتنا محنت کش ہے یہ آلودہ داماں دیکھ لے!

خاک اٹھتی ہے مری تا بن سکے اور آسماں
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیاباں دیکھ لے!

زبورِ عجم

حصه دوم

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

زبورِ عجم

حصہ دوم

شاخِ نہالِ سدرہ تُو خار و خسِ چمن نہ ہو
منکر ہو آس کا تُو مگر، منکرِ خویشتن نہ ہو

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

دگر دیوانۂ آید کہ در شہر افگند ہوئے
دو صد ہنگامہ بر خیزد ز سودائے کہ من دارم

مخور ناداں غم از تاریکئ شبہا کہ می آید
کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم

ندیمِ خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نداری تابِ آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

دکھا سکتا ہے دو عالم یہ مینا جو میں رکھتا ہوں
کہاں دیدہ کہ دیکھے وہ نظارا جو میں رکھتا ہوں

کوئی دیوانہ آئے شہر میں آوازِ ہُو اٹھے
دو صد ھنگاموں کا خالق ہے سودا جو میں رکھتا ہوں

نہ کر تاریکیوں کی فکر ، راتیں جنکو لائینگی
ہے روشن مثلِ کوکب داغِ سیما جو میں رکھتا ہوں

بناتا ہے ندیم اپنا مجھے ، یہ خوف ہے مجھ کو
نہ راس آئے تجھے آشوب و غوغا جو میں رکھتا ہوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱

ز خیر که آدم را هنگام نمود آمد
این مشتِ غبارے را انجم به سجود آمد!

آن راز که پوشیده در سینهٔ هستی بود
از شوخیِ آب و گل در گفت و شنود آمد!

۲

مه و ستاره که در راهِ شوق هم سفر اند
کرشمه سنج و ادا فهم و صاحبِ نظر اند

چه جلوه هاست که دیدند در کفِ خاکے
قفا نقابِ افلاک سوئے ما نگرند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱

اٹھو کہ خاکیوں کا یہ وقتِ نمود ہے
اُن کے لئے ستارہ سراپا سجود ہے

پوشیدہ تھا جو سینۂ ہستی میں ، اب وہ راز
شوخی سے آب و گل کی ، قرینِ شہود ہے

۲

ماہ و ستارہ شوق کی رہ میں ہیں ہم سفر
رمز آشنائے نار و ادا ، صاحبِ نظر

آئے پسند جلوے انہیں مشتِ خاک کے
ہے پشت سوئے آسماں ، اور ہیں زمیں نگر

۳

درونِ لاله گذر چون صبا توانی کرد
بیک نفس گرهِ غنچه وا توانی کرد

حیات چیست؟ جهان را اسیرِ جان کردن
تو خود اسیرِ جهانی کجا توانی کرد!

مقدر است که مسجودِ مهر و مه باشی
ولے هنوز ندانی چها توانی کرد!

اگر ز میکدۀ من پیالۀ گیری
ز مشتِ خاک جهانے بپا توانی کرد!

چساں بسینه چراغے فروختی اقبالؔ
بخویش آنچه توانی تما توانی کرد!

۳

روںِ لالہ ممکن ہے گزر مثلِ صبا تیرا
نفس، اک آن میں کر دے گرہ غنچے کی وا، تیرا

جہاں کو کر اسیرِ جاں، اسی میں زندگانی ہے
تو خود دنیا کا قیدی ہے، رواں ہو کار کیا تیرا

مقدر ہے کہ تو مسجودِ مہر و ماہ ہو جائے
مگر اس راز کو سمجھا نہ فکرِ نارسا تیرا

جو میرے میکدے سے ایک ساغر تجھ کو مل جائے
تو مشتِ خاک سے عالم بپا ہو گا نیا تیرا

کیا روشن چراغ اقبالؔ تو نے کیسے سینے میں
اجالا ہم کو بھی بخشے وہی دستِ عطا تیرا

۴

اگر به بحرِ محبت کرانه می خواهی
هزار شعله دهی یک زبانه می خواهی!

مرا ز لذتِ پرواز آشنا کردند
تو در فضای چمن آشیانه می خواهی!

نگه بدامنِ مردانِ آشنا آویز
ز یار اگر نگهِ محرمانه می خواهی

جنون نه داری و هوی فگندهٔ در شهر
سبو شکستی و بزمِ شبانه می خواهی!

تو هم بعشوه گری کوش و دلبری آموز
اگر ز ما غزلِ عاشقانه می خواهی

۴

طلب گر تو کرے بحرِ محبت میں کرانہ
عوض اک شعلہ کے کھوئے گا شعلوں کا خزانہ!

مجھے پرواز کی لذت سے فطرت نے نوازا
ترا مقصد فضائے گلستاں میں آشیانہ!

ہوں چندے ہم نشیں صاحب دلانِ آشنا کا
جو چاہے یار سے گا ہے نگاہِ محرمانہ

جنوں سے تو ہے حالی اور نگر میں شور تیرا؟
سبو کو توڑ کر ہے طالبِ بزمِ شبانہ!

ادائے دلبری۔ عشوہ گری کے سیکھ نکتے
غزل مجھ سے اگر تو چاہتا ہے عاشقانہ

۵

زمانه قاصدِ طیّار آن دلآرام است
چه قاصدے که وجودش تمام پیغام است!

گمان مبر که نصیبِ تو نیست جلوهٔ دوست
درونِ سینه هنوز آرزوے تو خام است!

گرفتم این که چو شاهین بلند پروازی
بهوش باش که صیّاد ما کهن دام است

باوجِ مشتِ غبارے کجا رسد جبریل
بلند نامیٔ او از بلندیٔ بام است!

تو از شمارِ نفس زندهٔ نمی دانی
که زندگی به شکستِ طلسمِ ایام است!

ز علم و دانشِ مغرب همین قدر گویم
خوش است آه و فغان تا نگاه ناکام است

من از هلال و چلیپا دگر نیندیشم
که فتنهٔ دگرے در ضمیرِ ایام است!

۵

مانہ لایا ہے ہم تک پیامِ دلآرام
جودِ قاصد طیار ہے پیام تمام!

گماں نہ کر کہ نہ ہوگا نگار کا دیدار
مگر ابھی ترے سینے میں آرزو ہے خام!

لند صورتِ شاہیں سہی تری پرواز
حذر! پرانا شکاری بچھا رہا ہے دام

نہ مشتِ خاک کی رفعت کو پا سکا جبریل
بلند با می سے اس کو ملی بلندیِ نام!

فس شمار تری زندگی، تو کیا جانے
کہ زندہ ہے وہی توڑے جو جادوے ایام!

علوم و دانشِ مغرب کی بات اتنی ہے
ہے خوب آہ و فغاں جب نگاہ ہے ناکام

مجھے نہیں ہے ہلال و صلیب سے کچھ خوف
اک اور فتنے کا گہوارہ ہے دلِ ایّام!

٦

دگر ز ساده دلیهائے یار نتوان گفت
نشسته بر سر بالین من ز درمان گفت!

زبان اگرچه دلیر است و مدعا شیرین
سخن ز عشق چه گویم جز این که نتوان گفت

خوشا کسے که فرو رفت در ضمیر وجود
سخن مثال گهر بر کشید و آسان گفت

خراب لذت آنم که چون شناخت مرا
عتاب زیر لبی کرد و خانه ویران گفت

سمن مشو که جهان راز خود برون ندهد
که آنچه گل نتوانست مرغ نالان گفت

پیام شوق که من بے حجاب می گویم
به لاله قطرهٔ شبنم رسید و پنهان گفت

اگر سخن همه شوریده گفته ام چه عجب
که هر که گفت ز گیسوے او پریشان گفت

٦

یار کی سادہ دلی کا ہو تو کیسے ہو بیاں
بیٹھ کر بالیں پہ کرتا ہے وہ ذکرِ درماں!

حوصلہ مند زباں ، مدعا شیریں بھی ہے
عشق کی بات مگر کیا ہو کہ عاجز ہے زباں

ہستی کے عسق میں آترا جو کوئی ، خوب ہوا
گوہرِ معنی لیے آیا بحرفِ آساں

مستِ لذت ہوا میں جب مجھے پہچان گیا
زیرِ لب غصے سے کہ اٹھا وہ 'خانہ ویراں،

ہو نہ عمگیں جو جہاں کا نہ کھلے تجھ پر راز
کہ جو گل کہہ نہ سکا ، کہہ گیا مرغِ نالاں

شوق کا مژدہ میں کہتا ہوں جسے بے پردہ
لالے سے قطرۂ شبنم نے کہا وہ پنہاں

شعر میرا ہے جو شوریدہ ، تعجب کیسا
اس کے گیسو کا ہے ہرلب پہ پریشاں ہی بیاں

۷

حرد ار دوقِ نظر گرمِ تماشا بود است
این که جویده ویابدهٔ هرموجود است

جلوهٔ پاک طلب.از مه وحورشید گزر
رانکه هر جلوهد رین‌دیرنگه آلوداست

۷

دکھایا ذوقِ نظر نے خرد کو منظرِ بود
تلاش کر لیا کوشش سے اس نے ہر موجود

وہ جلوہ ڈھونڈ کہ ہو بے نیازِ مہر و قمر
ہر ایک جلوہ ہے اس دھر میں نظر آلود

۸

غلام زنده دلانم که عاشقِ سره اند
نه خانقاه نشینان که دل به کس ندهند

بآن دلے که برنگ آشنا و بیرنگ است
عیارِ مسجد و میخانه و صنم کده اند

نگاه از مه و پرویں بلند تر دارند
که آشیان بگریبانِ کهکشان نهند

برون ز انجمنے درمیانِ انجمنے
بخلوت اند و لے آنچنان که با همه اند

بچشم کم منگر عاشقانِ صادق را
که ایں شکسته بهایان متاعِ قافله اند

به بندگان خطِ آزادگی رقم کردند
چنانکه شیخ و برهمن شبانِ بے رمه اند

پیاله گیر که مے را حلال می گویند
حدیث اگرچه غریب است راویان ثقه اند

۸

جو زندہ دل ہیں مخلص عشق میں ، وہ میرے سلطاں ہیں
نہ زاھد خانقاھوں کے کہ ھر اک سے گریزاں ہیں
وہ اس دل کی بدولت جو ہے رنگینی میں بھی بے رنگ
صنم خانہ کے ، میخانہ کے اور مسجد کے میزاں ہیں
نگاہیں ماہ و پروین سے بھی ھوتی ہیں بلند اُن کی
پرے ھو کہکشاں سے آشیاں ۔ وہ اِس کے خواھاں ہیں
درونِ انجمن رہ کر ، برونِ انجمن ہیں وہ
وہ خلوت میں رہیں لیکن رفیقِ نوعِ انساں ہیں
نہ جانو کم وقار اُن کو جو عشق اپنے میں صادق ہیں
متاعِ قافلہ ہیں یہ ، بظاھر گو یہ ارزاں ہیں
غلاموں کو ملا ہے اس طرح منشورِ آزادی
ہیں غائب گلّے اور شیخ و برھمن گلہ باناں ہیں
اٹھا ساغر ۔ لگا لب سے ۔ حلال اب مے کو کہتے ہیں
روایت ہے غریب[1] اِس کی ۔ پہ راوی پختہ انساں ہیں

[1] غریب - علم الحدیث کی اصطلاح میں وہ حدیث جس میں کسی جگہ ایک ہی راوی منفرد ہو -

۹

لالهٔ این چمن آلودهٔ رنگ است هنوز
سپر از دست مینداز که جنگ است هنوز

فتنهٔ را که دوصد فتنه بآغوشش بود
دخترے هست که در مهدِ فرنگ است هنوز

اے که آسوده نشینی لبِ ساحل برخیز
که ترا کار بگرداب و نهنگ است هنوز

از سرِ تیشه گذشتن ز خرد مندی نیست
اے بسا لعل که اندر دل سنگ است هنوز

باش ! تا پرده کشایم ز مقامِ دگرے !
چه دهم شرحِ نواها که بچنگ است هنوز !

نقش پردازِ جهان چون بجنونم نگریست
گفت ویرانه بسودائے تو تنگ است هنوز !

۹

لالہ اس باغ میں آلودہ ہے با رنگ ابھی
تھام لے اپنی سپر ، ختم نہیں جنگ ابھی

فتنہ آغوش میں جس کی ہیں دو صد فتنے نہاں
اس کی دختر ہے بہ گہوارۂ افرنگ ابھی

اٹھ کنارے سے ، یہ آرام کا ھنگام نہیں
ہے بھنور اور مگرمچھ سے تری جنگ ابھی

ترکِ تیشہ ہے خرد مندی سے دوری کا اثر
پنہاں رکھتا ہے کئی لعل دلِ سنگ ابھی

اک مقام اور ہے، میں پردہ اٹھاتا ہوں ، ٹھہر
ذکر کیا سُر کا جو مضمر ہے تہِ چنگ ابھی !

کی نگ خالقِ اکبر نے جنوں پر جو مرے
کہا، ویرانہ ہے سودا پہ ترے تنگ ابھی !

۱۰

تکیه بر حجت و اعجازِ بیان نیز کنند
کارِ حق گاه بشمشیر و سنان نیز کنند

گاه باشد که ته خرقه زره می پوشند
عاشقان بندۂ حال اند و چنان نیز کنند

چون جهان کهنه شود پاک بسوزند او را
و ازهمان آب وگل ایجادِ جهان نیز کنند

همه سرمایهٔ خود را بنگاهے بدهند
این چه قومیت که سودا بزیان نیز کنند

آنچه از موجِ هوا با پرِ کاهے کردند
عجبے نیست که با کوهِ گران نیز کنند

عشق مانندِ متاعے است ببازارِ حیات
گاه ارزان بفروشند و گران نیز کنند

تا تو بیدار شوی ناله کشیدم ورنه
عشق کارے است که بے آه و فغان نیز کنند

۱۰

کارِ حق حجّت و اعجازِ بیاں کرتے ہیں
گاہ ہوتا ہے کہ شمشیر و سناں کرتے ہیں

زیرِ خرقہ کبھی ہوتے ہیں زرہ پوش بھی وہ
بندۂ حال ہیں عاشق ، یہ عیاں کرتے ہیں

جب جہاں ہوتا ہے کہنہ تو جلا دیتے ہیں
راکھ سے اس کی پھر ایجاد جہاں کرتے ہیں

اک نظر کے لیے دے دیتے ہیں سرمایہ تمام
ہیں عجب لوگ جو سودائے زیاں کرتے ہیں

رکھتے ہیں تنکے کو آوارہ سرِ موجِ ہوا
کیا عجب ، کوہِ گراں کو جو رواں کرتے ہیں

عشق بھی جنسِ تجارت ہے ببازارِ حیات
ارزاں کرتے ہیں کبھی ، گاہ گراں کرتے ہیں

نالہ کش ہوں کہ تجھے خواب سے بیدار کروں
عشق ورنہ کبھی بے آہ و فغاں کرتے ہیں!

۱۱

چو موج مستِ خودی باش و سر بطوفاں کش
ترا کہ گفت کہ بنشیں و پا بداماں کش

بقصدِ صیدِ پلنگ از چمن سرا بر خیز
بکوہ رخت کشا خیمہ در بیاباں کش

بہ مہر و ماہ کمندِ گلو فشار انداز
ستارہ را ز فلک گیر و در گریباں کش

گرفتم ایں کہ شرابِ خودی بسے تلخ است
بدردِ خویش نگر زہرِ ما بدرماں کش

۱۱

خودی میں مست ہو جوں موج ۔ سر ہو طوفاں میں
نہ بیٹھ یوں کہ سمیٹے ہوں پاؤں داماں میں

چمن سرا سے نکل ۔ کر شکار چیتوں کا
سفر ہو کوہ میں ۔ خیمہ ترا بیاباں میں

ہو مہر و ماہ کی گردن کے گرد تیری کمند
ستارہ چھین فلک سے ۔ سجا گریباں میں

یہ مانا میں نے شرابِ خودی ہے تلخ بہت
جو درد تیرا ہے ۔ تلخی طلب ہے درماں میں

۱۲

خسرو وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید برون
کاروان زین وادیٔ دور و دراز آید برون

من بسیمای غلامان فرِّ سلطان دیده ام
شعلهٔ محمود از خاکِ ایاز آید برون!

عمرها در کعبه و بتخانه می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانای راز آید برون!

طرحِ نو می افگند اندر ضمیرِ کائنات
ناله ها کز سینهٔ اهلِ نیاز آید برون!

چنگ را گیرید از دستم که کار از دست رفت
نغمه ام خون گشت و از رگهای ساز آید برون!

۱۲

آئے گا خضرِ وقت اب بارگہِ حجاز سے
نکلے گا اپنا کارواں پھر سے رہِ دراز سے

چمکی ہے ہر غلام کے ماتھے پہ سطوت شہی
شعلۂ غزنوی اٹھا خاکِ درِ ایاز سے

صدیوں رہی ہے نالہ خیز کعبہ و دیر میں حیات
نکلے کوئی تو رازداں عشق کی بزمِ ناز سے

اور ابھر کے آئے گی ان سے ضمیر کائنات
نالے اگر بلند ہوں ولولۂ نیاز سے

لے مری چنگ کو سنبھال۔ میں نہیں اپنے آپ میں
نغمہ مرا ہوا ہے خوں۔ ٹپکا ہے میرے ساز سے

۱۳

ز سلطان کنم آرزوی نگاهی!
مسلمانم از گل نسازم الٰهی

دل بی‌نیازی که در سینه دارم
گدا را دهد شیوهٔ پادشاهی

ز گردون فتد آنچه بر لالهٔ من
فرو ریزم او را به برگ گیاهی

به پروین فرو ناید اندیشهٔ من
به دریوزهٔ پرتو مهر و ماهی

اگر آفتابی سوی من خرامد
به شوخی بگردانم او را ز راهی

به آن آب و تابی که فطرت ببخشد
درخشم چو برقی به ابر سیاهی

ره و رسم فرمانروایان شناسم
خران بر سر بام و یوسف بچاهی!

۱۳

سلطاں کی مجھ پہ کاش کبھی اک نگاہ ہو
مسلم ہوں میرا ملی کا کیسہ الٰہہ ہو

سینے میں میرے دل ہے وہ اک بے نیاز سا
یہ دل گدا بھی پائے گا تو وہ پادشاہ ہو

گردوں سے میرے لالے یہ گرتی ہے جو آسے
ٹیکا رہا ہوں میں کہ ہرا برگ گاہ ہو

پروین کی طرح پیچھے نہ اتریگا میرا فکر
سائل نہ ہو گا سامنے گو مہر و ماہ ہو

آئے خرامِ ناز سے جو آفتاب بھی
شوخی سے پھیردوں آسے آوارہ راہ ہو

اس آب و تاب سے مجھے فطرت سے جو ملی
وہ برق ہوں کہ رخشاں ابر سیاہ ہو

واقف ہوں حکمرانوں کی میں رسم و راہ سے
خر بام پر براجیں اور یوسف بہ چاہ ہو

با نشهٔ درویشی در ساز و دمادم زن
چون پخته شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

گفتند جهانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم که نمی سازد! گفتند که برهم زن!

در میکده ها دیدم شائسته حریفے نیست!
با رستمِ دستان زن با مغبچه ها کم زن

اے لالهٔ صحرائی تنها نتوانی سوخت
این داغِ جگر تابے بر سینهٔ آدم زن

تو سوزِ درونِ او . تو گرمیٔ خونِ او
باور نکنی؟ چاکے در پیکرِ عالم زن

عقل است چراغِ تو؟ در راهگذارے نه
عشق است ایاغِ تو؟ با بندهٔ محرم زن

لختِ دلِ پرخونے از دیده فرو ریزم
لعلے ز بدخشانم بردار و بخاتم زن!

۱۴

سمو کر نشّہ درویشی کا ساغر پُر دمادم کر
ہو جب پختہ ۔ تہ و بالا نظامِ کشورِ جم کر

سوال اُن کا یہ تھا ۔ کیا اس جہاں سے تیری بنتی ہے؟
کہا میں نے ۔ نہیں سنتی وہ بول اٹھے کہ برہم کر!

میں دیکھ آیا ہوں میخانے ۔ نہیں موزوں حریف اُن میں!
ہو صحبت رستمِ دستاں سے میلِ مُغ بچہ کم کر

نہیں ممکن کسی صحرا میں تنہا جلنا ، اے لالہ!
جگر سوزی کا رسیا داغ اپنا ، نذرِ آدم کر

تو ہے سوزِ دروں اُس کا ، تو اُس کا گرمیٔ خوں بھی
نہ آئے گر یقیں تجھ کو وگار اندامِ عالم کر

چراغِ عقل گر ہے پاس تیرے ، رہ گزر پر رکھ
ایاغِ عشق رکھتا ہے؟ شریکِ بزمِ محرم کر

دلِ پُر خوں کے ٹکڑے اپنے اشکوں میں بہاتا ہوں
اٹھا میرے بدخشاں سے تُو لعل اور زیبِ خاتم کر!

هوس هنوز تماشاگر جهانداری است
دگر چه فتنه پس پرده‌های زنگاری است

زمان زمان شکند آنچه می تراشد عقل
بیاکه عقل مسلمان و عقل زنّاری است!

امیر قافلهٔ سخت کوش و پیهم کوش
که در قبیلهٔ ما حیدری ز کرّاری است

تو چشم بستی و گفتی که این جهان خواب است
کشای چشم که این خواب خواب بیداری است

خلوت انجمنی آفرین که فطرت عشق
یکی شناس و تماشا پسند بسیاری است

تپید یک دم و کردند زیب فتراکش
خوشا نصیب غزالی که زخم او کاری است

بباغ و راغ گهرهای نغمه می پاشم
گران متاع و چه ارزان ز کسد بازاری است!

۱۵

هوس اب تک دکھاتی ہے تماشائے جہانداری
چھپائے کون سا فتنہ ہیں پردہ ہائے زنگاری؟

تراشے جس کو عقل اس کو وہ خود کردیتی ہے ٹکڑے
مسلماں۔ عشق خود آگاہ ہے اور عقل ربآری!

امیر قافلہ گر تو ہے۔ پیہم سخت کوشی کر
کہ اپنی قوم میں ہے حیدری کا راز کرّاری

کہا یہ تو نے آنکھیں بند کرکے۔ خواب ہے دنیا
ذرا کر چشم وا۔ یہ خواب بھی ہے خواب بیداری

بپا کر انجمن خلوت میں۔ فطرت عشق کی یہ ہے
کہ ہے وحدت شناس اور دید کثرت ہے اسے پیاری

تڑپ کر لحظہ بھر وہ ہو گیا فتراک کی زینت
غزال بخت ور وہ ہے کہ جس کا زخم ہے کاری

میں باغ و راغ میں برسا رہا ہوں نغمے کے موتی
ہوئی جنس گراں ارزاں۔ ہے کیسی سرد بازاری!

۱۶

فرشته گرچه برون از طلسمِ افلاک است
نگاهِ او بتماشاے این کفِ خاک است

گمان مبر که بیکِ شیوه عشق می بازند
قبا بدوشِ گل و لاله بے جنون چاک است

حدیث شوق ادا می توان بخلوتِ دوست
بناله‌ٔ که ز آلائشِ نفس پاک است !

توان گرفت ز چشمِ ستاره مردم را
خرد بدستِ تو شاهینِ تند و چالاک است

کشاے چهره که آنکس که لن ترانی گفت
هنوز منتظرِ جلوهٔ کفِ خاک است

دریں چمن که سرود است و این نوا ز کجاست؟
که غنچه سر بگریبان و گل عرقناک است !

۱٦

فرشتہ گو نہیں مسحورِ جادوئے افلاک
یہ مرکز اس کی نگہ کا رہی یہی کفِ خاک

گماں نہ کر کہ رہا عاشقی کا اک انداز
کہ بے جنوں ہے گل لالہ کا گریباں چاک

حریمِ دوست میں ہے شوق کا بیاں ممکن
نہ شکلِ نالہ جو آلائشِ نفس سے ہو پاک

اچکنا سہل ہے اختر کی آنکھ سے مردم
تری خرد کا ہے شاہیں جو تیز اور چالاک

اٹھا نقاب کہ وہ لن ترانی گوئے قدیم
ہے منتظر کہ دکھائیگی جلوہ کب کفِ خاک

چمن میں کس کی اٹھی لےَ۔ کہاں سے آئی ہوا؟
کہ غنچہ سر بگریباں ہے، روئے گل نمناک

عرب که باز دهد محفلِ شبانه کجاست؟
عجم که زنده کند رودِ عاشقانه کجاست؟

درونِ خرقهٔ پیران سبوچه ها خالی است
فغان که کس نشناسد مئے جوانه کجاست؟

درین چمن کده هر کس نشیمنے سازد
کسے که سازد و وا سوزد آشیانه کجاست؟

هزار قافله بے گانه‌وار دید و گزشت
ولے که دید باندازِ محرمانه کجاست؟

چو موج خیز و به یم جاودانه می آویز
کرانه می طلبی بے خبر کرانه کجا است؟

بیا که در رگِ تاکِ تو خونِ تازه دوید
دگر مگوے که آن بادهٔ مغانه کجا ست؟

بیک نورد فرو پیچ روزگاران را
ز دیر و زود گزشتی دگر زمانه کجاست!

۱۷

عرب کہ پھر ہمیں دے محفلِ شبانہ۔ کہاں
عجم کہ زندہ کرے سازِ عاشقانہ ۔ کہاں

سبو چے پیروں کے خرقوں کے بیچے خالی ہیں
کسی کو سدھ نہیں۔ ڈھونڈیں مئے جوانہ کہاں

ہے حواہاں ہر کوئی گلشن میں اک نشیمن کا
سا کے خود ہی جلا دے جو آشیانہ ۔ کہاں

ہزار قافلے بیگانہ وار گزرے ہیں
مگر جو دیکھے باندازِ محرمانہ ۔ کہاں

مثالِ موج آبھر ۔ بحر سے الجھتا جا
تو ڈھونڈتا ہے کرانہ مگر کرانہ کہاں

رواں رگوں میں مرے تاک کی ہے تازہ لہو
نہ پوچھ اب کہ ملیگی مئے مغانہ کہاں

لپیٹ دے فقط اک جست میں زماں کی بساط
تو دیر و زود سے بالا ہے۔ پھر زمانہ کہاں !

۱۸

مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز
دامان گل و لاله کشیدن دگر آموز
اندر دلک غنچه خزیدن دگر آموز!

موئینه نه برکردی و بی ذوق تپیدی
آن گونه تپیدی که بجائی نه رسیدی
در انجمن شوق تپیدن دگر آموز!

کاور! دل آواره دگر باره باوبند
بر خویش کشا دیده و از غیر فروبند
دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز!

دم چیست؟ پیام است شنیدی؟ نشنیدی!
در خاک تو یک جلوهٔ عام است ندیدی!
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

۱۸

اٹھ مثلِ صبا چلنے کا انداز نیا سیکھ
کھینچے جو گل و لالہ کا دامن وہ ادا سیکھ
در آنا دلِ غنچہ میں بے جنبشِ پا سیکھ!

موئینہ قبا! تیری یہ بے ذوق تپش تھی
وہ تیری تپش جس سے تو پہنچا نہ کہیں بھی
آ انجمنِ شوق میں پھر سوزِ و فا سیکھ!

کافر! دلِ آوارہ کو پھر اس کی طرف موڑ
ہر حود نگراں، دیکھنا غیروں کی طرف چھوڑ
پھر دیکھنا نہ دیکھنا، بادیدۂ وا سیکھ!

ہر سانس ہے پیغام پہ تو گوش گراں ہے
مٹّی میں تری جلوۂ عام ایک نہاں ہے
گر دیکھنے سن لینے کا پہلے سے سوا سیکھ!

ما چشمِ عقاب و دلِ شهباز نداریم
چون مرغِ سرا لذتِ پرواز نداریم
اے مرغِ سرا خیز و پریدن دگر آموز!

تختِ جم و دارا سرِ راهے بفروشند
این کوهِ گران است بکاهے بفروشند
با خونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز!

نالیدی و تقدیر همان است که بود است
آن حلقهٔ زنجیر همان است که بود است
نومید مشو! ناله کشیدن دگر آموز!

وا سوختهٔ! یک شرر از داغِ جگر گیر!
یک چند خود پیچ و نیستان همه در گیر!
چون شعله بخاشاک دویدن دگر آموز

ہم میں نہیں ہے چشمِ عقاب و دلِ شہباز
جُوں مرغِ سرا دل میں نہیں لذتِ پرواز
اٹھ مرغِ سرا ، شیوۂ پروازِ فضا سیکھ!

تختِ جم و دارا سرِ راہے نہ ملیگا
یہ کوہِ گراں قدر بہ کاہے نہ ملیگا
قیمت ترےدل کاھےلہو رمزِشرا سیکھ

تو نالہ کناں ہے تری تقدیر وہی ہے
بے چین ہے تو حلقۂ زنجیر وہی ہے
مایوس نہ ہو ، نالہ کا انداز نیا سیکھ!

تو جل بجھا ۔ لیے داغِ جگر ہی سے شرارا
خود دار ہو ۔ پہلو میں سمو نیستاں سارا
خاشاک کےحق میں روشِ برقِ فنا سیکھ!

۱۹

ای غنچهٔ خوابیده چو نرگس نگران خیز
کاشانهٔ ما رفت بتاراجِ غمان خیز
از نالهٔ مرغِ چمن، از بانگِ اذان خیز
از گرمیٔ هنگامهٔ آتش نفسان خیز
از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز!
از خوابِ گران خیز!

خورشید که پیرایه بسیمای سحر بست
آویزه بگوشِ سحر از خونِ جگر بست
از دشت و جبل قافله ها رختِ سفر بست
ای چشمِ جهان بین به تماشای جهان خیز
از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز!
از خوابِ گران خیز!

۱۹

اٹھ سوئی کلی، سیکھ سبق دیدہ وراں سے
کاشانہ ہمارا ہے نگوں بارِ عیاں سے!
بیدار ہو بلبل کی نوا، بانگِ اذاں سے
اٹھ گرمئی ہنگامۂ آتش نفساں سے!
اٹھ خواب گراں، خواب گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے!

خورشید نے جھومر دیا سیمائے سحر کو
اور کان کا آویزہ کیا خون جگر کو!
ہر سمت اٹھے قافلے آمادۂ سفر کو
اے چشمِ جہاں بیں تو شناسا ہو جہاں سے
اٹھ خواب گراں، خواب گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے!

خاور همه مانندِ غبارِ سرِ راہے است
یک نالهٔ خاموش و اثر باخته آہے است
هر ذرهٔ این خاک گره خورده نگاہے است
ار هند و سمرقند و عراق و همدان خیز
ار خوابِ گران ، خوابِ گران خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز!

دریاے تو دریاست که آسوده چو صحراست
دریاے تو دریاست که افزون نشدو کاست
بیگانهٔ آشوب و نهنگ است چه دریاست!
ار سینهٔ چاکش صفتِ موجِ روان خیز
ار خوابِ گران ، خوابِ گران خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز!

مشرق ہوا بس ایک غبارِ سرِ راہ ہے
اک نالۂ بے صوت و صدا ، بے اثر آہ ہے
ہر ذرہ ہے اس خاک کا افسردہ نگاہ ہے
اٹھ ہند و سمرقند و عراق و ہمداں سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے!

صحرا کی طرح وقفِ سکوں ہے ترا دریا
چڑھنے بھی نہ پایا کہ کناروں سے یہ اترا
طوفاں نہ نہنگ اس میں، یہ دریا ہے تو کیسا
اٹھ سینے سے اس کے روشِ موجِ رواں سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے!

این نکته کشانیدهٔ اسرارِ نهان است
ملک است تنِ خاکی و دین روحِ روان است
تن زنده و جان زنده ز ربطِ تن وجان است
با خرقه و سجاده و شمشیر و سنان خیز
از خوابِ گران، خوابِ گران خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز!

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہان را تو یساری تو یمینی
اے بندهٔ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقین درکش واز دیرِ گماں خیز
از خوابِ گران، خوابِ گران خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز!

نکتہ یہی اک کاشفِ اسرارِ نہاں ہے
کشورِ تنِ خاکی ہے تو دیں روح و رواں ہے
ہونگے تن وجاں زندہ جو ربطِ تن وجاں ہے
سج خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں سے
اٹھ خوابِ گراں، خواب گراں خواب گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے!

ناموسِ ازل کا تو امیں ہے، تو امیں ہے!
دارائے جہاں کو تو یسار اور یمیں ہے
اے بندۂ خاکی تو زماں ہے تو زمیں ہے
صہبائے یقیں نوش کر اٹھ دیرِ گماں سے
اٹھ خوابِ گراں، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے!

فریاد ز افرنگ و دلآویزیِ افرنگ

فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ

عالم همه ویرانه ز چنگیزیِ افرنگ

معمارِ حرم ! باز به تعمیرِ جهان خیز

از خواب گران . خوابِ گران خوابِ گران خیز

از خوابِ گران خیز !

فریاد فرنگ اور دلآویزی سے آس کی
فریاد ہے شیرینی و پرویزی سے آس کی
ویرانہ جہاں سارا ہے چنگیزی سے آس کی
معمارِ حرم ! کام لے تعمیر جہاں سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خواب گراں سے!

۲۰

جهان ما همه خاک است و نے سپهر گردد
ندانم این که نفسهائے رفته بر گردد

شبے که گورِ غریبان نشیمن است او را
مه و ستاره ندارد چسان سحر گردد ؟

دلے که تاب و تبِ لازوال می طلبد
کرا خبر که شود برق یا شرر گردد

نگاهِ شوق و خیال بلند و ذوق وجود
مترس ازیں که همه خاکِ رهگزر گردد

چناں بزی که اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردهٔ خود شرمسار تر گردد!

۲۰

جہاں ہے خاک عجب کیا جو راهی هو جائے
نہیں خبر مجھے بیتا زمانه لوٹ آئے

وہ شب جو گور غریباں پہ آکے چھائی ہے
ہے بے ستارہ و مه ۔ کس طرح سحر پائے؟

جو دل ہے تاب و تبِ لازوال کا طالب
کسے خبر وہ شرر هو که برق بن جائے

نگاہِ شوق و خیالِ بلند و ذوقِ وجود
جو خاکِ راهگزر هوں ، نه کوئی گھبرائے

یوں جی که موت ہماری اگر دوامی ہے
خدا خود اپنے کئے پر کمال شرمائے!

۲۱

باز بر رفته و آئنده نظر باید کرد
هله بر خیز! که اندیشه دگر باید کرد

عشق بر ناقهٔ خویش کشد محملِ خویش
عاشقی؟ راحله از شام و سحر باید کرد

پیرِ ما گفت جهان بر روشے محکم نیست
از خوش و ناخوش او قطعِ نظر باید کرد

تو اگر ترکِ جهان کرده سرِ او داری
پس نخستین ز سرِ خویش گزر باید کرد

گفتمش در دلِ من لات و منات است بسے
گفت این بتکده را زیر و زبر باید کرد

۲۱

فردا و دوش کی طرف گاہ نظر چاہیے
دیکھ کہ فکر کو ترے طرزِ دگر چاہیے

اپنے ہی ناقے پہ سدا محملِ عشق سجتا ہے
عاشق ہے توُ تو راحلۂ شام و سحر چاہیے

دانا کہیں جہاں کی کب رہی ایک سی روش
اچھے برے سے اِس کے تو قطعِ نظر چاہئے

کر کے جہاں کو ترک تُو طالب ہے اس کے قرب کا
پہلے خود اپنے آپ سے عزمِ سفر چاہئے

میں نے کہا کہ دل میں ہیں لات و منات بس رہے
بولے یہ بتکدہ تو بس زیر زبر چاہئے

خیالِ من به تماشای آسمان بود است
بدوشِ ماه و بآغوشِ کهکشان بود است

گمان مبر که همین خاکدان نشیمنِ ما است
که هر ستاره جهان است یا جهان بود است!

چشمِ مورِ فرومایه آشکار آید
هزار نکته که از چشمِ ما نهان بود است

زمین به پشتِ خود الوند و بے ستون دارد
غبارِ ماست که بر دوشِ او گران بود است

ز داغِ لالهٔ خونین پیاله می بینم
که این گسسته نفس صاحبِ فغان بود است!

۲۲

ہر دم خیال اپنا سوئے آسماں رہا
دوشِ قمر پہ یا وہ سرِ کہکشاں رہا

اس خاکداں کو اپنا نشیمن سمجھ نہ تو
ہر اختر اک جہاں ہے یا اک جہاں رہا

چشمِ حقیرِ مور پر وہ آشکار ہے
ہر نکتہ جو ہماری نظر سے نہاں رہا

رکھے ہے پشت پر زمیں، الوند و بے ستوں
لیکن اُسے غبار ہمارا گراں رہا

لالہ کے داغ و کاسۂ خونیں سے ہے عیاں
یہ نیم جان بھی کبھی صاحب فغاں رہا

۲۳

از نوای من قیامت رفت و کس آگاه نیست
پیشِ محفل جز بم و زیر و مقام و راه نیست

در نهادم عشق با فکرِ بلند آمیختند
ناتمامِ جاودانم کارِ من چون ماه نیست

لب فرو بند از فغان در ساز با دردِ فراق
عشق تا آهی کشد از جذبِ خویش آگاه نیست

شعلهٔ می باش و خاشاکی که پیش آید بسوز!
خاکیان را در حریمِ زندگانی راه نیست

خرد شاهینی بمرغانِ سرا صحبت مگیر
خیز و بال و پر کشا پروازِ تو کوتاه نیست

کرمِ شب‌تاب است شاعر در شبستانِ وجود
در پر و بالش فروغی گاه هست و گاه نیست

در غزل اقبالؔ احوالِ خودی را فاش گفت
زانکه این نو کافر از آئینِ دیر آگاه نیست

۲۳

نوا سے کیا قیامت مجھ پہ ٹوٹی ، کون ہے آگاہ
کہ محفل ہو چکی محوِ ہم وزیر و مقام و راہ

مری فطرت میں عشق اور فکرِ عالی ہیں بہم دونوں
ہے میری با تمامی جاوداں برعکسِ حالِ ماہ

فغاں لب پر نہ آئے دردِ ھجراں کو گوارا کر
جو عشق آھیں بھرے وہ جذب اپنے سے نہیں آگاہ

ہو شعلہ، پھونک دے خاشاک جو ہو سامنے تیرے
حریمِ زندگی میں یا نہیں سکتے ہیں خاکی راہ

تو شاھیں ہے تری مرغِ سرا سے کیوں رفاقت ہو
اڑ اپنے بال و پر سے ، تو نہیں پرواز میں کوتاہ

شبستاں ہے وجود اور اس میں شاعر گویا جگنو ہے
ابھی رخشاں ہیں بال و پر، ابھی گم روشنی ناگاہ

غزل میں رازِ احوالِ خودی اقبالؔ نے کھولے
کہ بتخانہ کے آئیں سے یہ نو کافر نہیں آگاہ

۲۴

شراب میکدهٔ من نه یادگار جم است
فشردهٔ جگر من بشیشهٔ عجم است

چو موج می تپد آدم بجستجوی وجود
هنوز تا به کمر درمیانهٔ عدم است

بیا که مثل خلیل این طلسم در شکنیم
که جز تو هرچه درین دیر دیده ام صنم است

اگر بسینهٔ این کائنات در نروی
نگاه را به تماشا گداختن ستم است

غلط خرامی ما نیز لذتی دارد
خوشم که منزل ما دور و راه خم بخم است

تغافلی که مرا رخصت تماشا داد
تغافل است و به از التفات دمبدم است

مرا اگرچه به بتخانه پرورش دادند
چکید از لب من آنچه در دل حرم است!

مرے میکدہ کی صہبا نہیں یادگارِ جم ہے
یہ مرے جگر کا خوں ہے جو بہ شیشۂ عجم ہے

رہا جستجوے ہستی میں جوں موج بیکل انساں
مگر اب بھی یہ کمر تک تہِ پردۂ عدم ہے

آ خلیل وار ہم بھی یہ طلسم توڑ ڈالیں
یہ ہے دیر اس میں جو کچھ ہے ترے سوا صنم ہے

نہ اتر سکے جو تیری نگہ سینۂ جہاں میں
تو فقط نظارہ بازی ری آنکھ پر ستم ہے

یہ غلط روی ہماری بھی ہے رازدارِ لذت
میں ہوں خوش کہ دور منزل، مری راہ خم بخم ہے

مجھے بخش دی تغافل نے ہے رخصتِ نظارہ
یہ ہے اس نظر سے بہتر جو کریم دمبدم ہے

مری عمر گرچہ گزری ہے فضاے بتکدہ میں
وہی میرے لب پہ آیا جو غمِ دلِ حرم ہے

۲۵

لالهٔ صحرایم از طرفِ خیابانم برید
در هوای دشت و کهسار و بیابانم برید

روبهی آموختم از خویش و دور افتاده ام
چاره پرداران! بآغوشِ نیستانم برید

در میانِ سینه حرفے داشتم گم کرده ام
گرچه پیرم پیشِ ملّائے دبستانم برید

سازِ خاموشم نوائے دیگرے دارد هنوز
آنکه بازم پرده گرداند پئے آنم برید

در شبِ من آفتابِ آن کہن داغے بس است
این چراغِ زیرِ فانوس از شبستانم برید

من که رمزِ شهریاری با غلامان گفته ام
بندهٔ تقصیر وارم پیشِ سلطانم برید

۲۵

لالۂ صحرا ہوں ، بیرونِ خیاباں لے چلو
مجھ کو سوئے دشت و کہسار و بیاباں لے چلو

رو ہی سیکھی ہے میں نے ، دور خود سے ہو گیا
چارہ پردارو اٹھو ، مجھ کو نیستاں لے چلو

حرف تھا اک میرے سینے میں وہ میں نے کھو دیا
پیر ہوں میں گرچہ مجھ کو پھر دبستاں لے چلو

رکھتا ہے اک اور بھی نغمہ مرا سازِ خموش
مجھ کو اس کے پاس جو ہو پردہ گرداں لے چلو

میری شب کو بس مرا داغِ کہن کا آفتاب
شمع جو فانوس کے اندر ہے پنہاں لے چلو

میں نے رمزِ شہریاری کی غلاموں کو عطا
ہو گئی تقصیر مجھ سے ۔ پیشِ سلطاں لے چلو

۲۶

سخنِ تازه زدم کس به سخن وا نرسید
جلوه خون گشت و نگاهی به تماشا نرسید

سنگ می باش و درین کارگهِ شیشه گذر
وای سنگی که صنم گشت و به مینا نرسید!

کعبه را در شکن و باز به تعمیر حرام
هر که در ورطهٔ 'لا' ماند به 'الّا' نرسید

ای خوش آن جوی تنک مایه که از ذوقِ خودی
در دلِ خاک فرو رفت و به دریا نرسید

از کلیمی سبق آموز که دانای فرنگ
جگرِ بحر شگافید و به سینا نرسید

عشق اندازِ تپیدن ز دلِ ما آموخت
شررِ ماست که بر جست و به پروانه رسید!

۲۶

کوئی میرے تازہ سخن کا شناسا نہ آیا
ہوا جلوہ خوں ۔ کوئی بہرِ تماشا نہ آیا

یہ ہے کارگہ شیشہ کی ۔ سنگ بن کر گزر جا
وہ کیا سنگ جو بت بنا ، سوئے مینا نہ آیا!

مٹا دے جو کہنہ ہے ۔ تعمیرِ نو کا ہو بانی
جو 'لا' کے بھنور میں رہا تا بہ 'اِلّا' نہ آیا

وہ اچھا ہے کم آب نالہ جو ذوقِ خودی سے
ہوا خاک میں جذب لیکن بہ دریا نہ آیا

سبق پھر کلیمی کا تو پڑھ کہ دانا فرنگی
نے چیرا سمندر کا سینہ ، بہ سینا نہ آیا

مرے دل سے سیکھی یہ طرزِ تپش عشق نے بھی
شرر میرا اک جست میں بن کے پروانہ آیا

۲۷

عاشق آن نیست که لب گرمِ فغانی دارد
عاشق آن است که بر کف دو جهانی دارد!

عاشق آن است که تعمیر کند عالمِ خویش
در نسازد به جهانی که کرانی دارد

دلِ بیدار ندادند به دانای فرنگ
این قدر هست که چشمِ نگرانی دارد

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
گرچه در کاسهٔ زر لعلِ روانی دارد

دردِ من گیر که در میکده ها پیدا نیست
پیر مردی که مئِ تند و جوانی دارد!

۲۷

عاشق نہیں لبوں کو جو گرمِ فغاں رکھے
عاشق ہے جو ہتھیلی پہ دونوں جہاں رکھے!

عاشق وہ جو بنائے جہاں اپنا آپ ہی
دنیا نہ وہ قبول کرے جو گراں رکھے

بیدار دل نہیں ملا دانائے غرب کو
یہ ہے کہ آنکھ کو نگراں ہر زماں رکھے

گم عشق ڈس رہی ہے خرد اُس کو مثلِ مار
ہرچند جام زر میں یہ لعلِ رواں[1] رکھے

لے درد مجھ سے، میکدوں میں اب نہ پائے گا
وہ پیر مرد، بادہ جو تند و جواں رکھے!

۱ - لعلِ رواں - سرخ شراب

۲۹

ما از خدائے گم شده ایم او به جستجوست
چون ما نیازمند و گرفتار آرزوست

گاهی به برگ لاله نویسد پیام خویش
گاهی درون سینهٔ مرغان به هاؤ هوست

در نرگس آرمید که بیند جمال ما
چندان کرشمه دان که نگاهش به گفتگوست!

آهی سحر گهی که زند در فراق ما
بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سوست!

هنگامه بست از پئے دیدار خاکئے
نظاره را بهانه تماشائے رنگ و بوست

پنهان به ذره ذره و نا آشنا هنوز
پیدا چو ماهتاب و به آغوش کاخ و کوست

در خاکدان ما گهر زندگی گم است
این گوهرے که گم شده مائیم یا که اوست!

بچھڑے ہیں ہم خدا سے، وہ اب جستجو میں ہے
ہم سا نیاز مند عمِ آرزو میں ہے

لکھتا ہے برگِ لالہ پہ ایسا کبھی پیام
سینے میں طائروں کے کبھی ھا و ھو میں ہے

نرگس کی آنکھ سے ہے ہمیں دیکھتا کبھی
ایسا کرشمہ گر ہے. نظر گفتگو میں ہے!

بھرتا ہے آہ صبح ہمارے فراق میں
پھیلی ہوئی صدا آسی کی چار سو میں ہے!

حاکی کی دید کے لیے ہنگامہ ہے یہ سب
نظارے کا بہانہ یونہی رنگ و بو میں ہے

پنہاں ہے ذرے ذرے میں. نایاب ہے مگر
وہ مثلِ ماہ. پہلوے ہر کاخ و کو میں ہے

اس خاکداں میں گم ہوا ہے گوہرِ حیات
گوہر وہ ہم ہیں یا وہی جو جستجو میں ہے

خواجه از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفای ده خدایان کشتِ دهقانان خراب
انقلاب !
انقلاب ! ای انقلاب !

شیخِ شهر از رشتهٔ تسبیح صد مومن بدام
کافرانِ ساده دل را برهمن زنّار تاب
انقلاب !
انقلاب ! ای انقلاب !

میر و سلطان نرد باز و کعبتینِ شان دغل
جانِ محکومان زتن بردند و محکومان بخواب !
انقلاب !
انقلاب ! ای انقلاب !

۳۰

خونِ رگِ مزدور سے خواجہ کو حاصل لعلِ ناب
دہ خداؤں کی جفا سے کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب !
انقلاب ! اے انقلاب !

رشتۂ تسبیحِ شیخِ شہر میں مومن اسیر
گردنِ کافر پہ زنّارِ برہمن کا عذاب
انقلاب !
انقلاب ! اے انقلاب !

میر و سلطان نردباز اور اُن کے پانسے پُرفریب
جانیں محکوموں کی لیں، محکوم اب تک محوِ خواب
انقلاب !
انقلاب ! اے انقلاب !

واعظ اندر مسجد و فرزندِ او در مدرسه
آں بہ پیری کودکے ایں پیر در عہدِ شباب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

اے مسلمانان فغان از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہان ارزان و یزدان دیر یاب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

شوخیٔ باطل نگر! اندر کمینِ حق نشست!
شپّر از کوری شبیخونے زند بر آفتاب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

خود رہا مسجد میں واعظ ، مدرسے میں ہے پسر
طفل وہ پیری میں اور یہ پیر با وصفِ شباب !
انقلاب !
انقلاب ! اے انقلاب !

اے مسلماں فتنہ ہائے علم و فن سے الاماں
اہرمن ارزاں جہاں میں اور یزداں دیریاب
انقلاب !
انقلاب ! اے انقلاب !

شوخی اس کی دیکھیے ، باطل ہے حق کی گھات میں
بے بصر شپّر ہے شبخوں زن خلافِ آفتاب
انقلاب !
انقلاب ! اے انقلاب !

در کلیسا ابنِ مریم را بدار آویختند!
مصطفیٰ از کعبه هجرت کرده با امّ الکتاب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

من درونِ شیشه هائے عصرِ حاضر دیده ام
آنچناں زهرے که ازوے مارها در پیچ و تاب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

با ضعیفاں گاه نیروئے پلنگاں می دهند
شعلهٔ شاید برون آید ز فانوسِ حباب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

ابنِ مریم کو کلیسا میں ہوئی سولی نصیب!
کعبہ سے مجبورِ ہجرت مصطفیٰ مع الکتاب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

عصرِ حاضر کے ہیں مینا میرے سب دیکھے ہوئے
زہر وہ ہے ان میں جس سے سانپ کھائے پیچ و تاب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

گاہ دیتے ہیں ضعیفوں کو بھی نیروئے پلنگ
وقت ہے پیدا کرے اک شعلہ فانوسِ حباب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

گرچه می دانم که روزنے بے نقاب آید برون
تا نه پنداری که جاں از پیچ و تاب آید برون!

ضربتے باید که جانِ خفته بر خیزد ز خاک
ناله کے بے زخمه از تارِ رباب آید برون

تاک خویش از گریه‌هائے نیم‌شب سیراب دار
کز درونِ او شعاعِ آفتاب آید برون

ذرهٔ بے مایهٔ ترسم که ناپیدا شوی
پخته تر کن خویش را تا آفتاب آید برون

درگزر از خاک وخود را پیکرِ خاکی مگیر
چاک اگر درسینه ریزی ماهتاب آید برون!

گر بروے تو حریمِ خویش را در بسته اند
سر بسنگِ آستاں زن لعلِ ناب آید برون!

۳۱

اک دن وہ آئے گا کہ وہ جب بے حجاب ہو
ممکن نہیں کہ جاں کبھی بے پیچ و تاب ہو!

وہ ضرب ہو کہ سوئی ہوئی جان جاگ اٹھے
بے زخمہ کیسے نالہ رن تارِ رباب ہو

یوں اپنا تاک اپنے سرشکِ شبی سے سینچ
بر آمد اس سے روشنیِ آفتاب ہو

بے مایہ ذرّہ! مٹ ہی نہ جائے ترا وجود
کر خود کو پختہ تر کہ تو خود آفتاب ہو

اٹھ خاک سے کہ تو نہیں ہے پتلا خاک کا
کر چاک سینہ تا کہ عیاں ماھتاب ہو

اپنے حریم کو اگر در بستہ وہ رکھیں
سر پھوڑ سنگِ آستاں بھی لعلِ ناب ہو

کشاده رو ز خوش و نا خوشِ زمانه گزر
ز گلشن و قفس و دام و آشیانه گزر

گرفتم این که غریبی و ره شناس نهٔ
بکوئے دوست باندازِ محرمانه گزر

هر نفس که بر آری جهان دگرگون کن
درین رباطِ کهن صورتِ زمانه گزر

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند
کرشمه بر دلِ شان ریز و دلبرانه گزر

۳۲

هنسی خوشی سے نشاط وغم ِ زماں سے گزر
قفس سے ، دام سے ، گلشن سے آشیاں سے گزر

یہ مانا اجنبی ہے تُو یہ رہ شناس نہیں
یہ کوئے یار ہے ، اندازِ محرماں سے گزر

نفس نفس سے نظامِ جہاں دگرگوں کر
زمانہ وار مقامِ مسافراں سے گزر

کریں جو حور بھی ، جبریل بھی عناں گیری
کرشمہ کار ہو ۔ اندازِ دلبراں سے گزر

۳۳

زندگی در صدفِ خویش گهر ساختن است
در دلِ شعله فرورفتن و نگداختن است

عشق ازین گنبدِ در بسته برون تاختن است
شیشهٔ ماه ز طاق فلک انداختن است

سلطنت نقدِ دل و دین ز کف انداختن است
به یکے داد جهان بردن و جان باختن است

حکمت و فلسفه را همتِ مردے باید
تیغِ اندیشه بروئے دو جهان آختن است

مذهبِ زنده دلاں خواب پریشانے نیست
از همیں خاک جهانِ دگرے ساختن است!

زندہ ہے وہ جو اپنی صدف میں ہو درّہ ساز
شعلہ نشیں ہو مگر پیکر نہ ہو گداز

عاشق ہے وہ جو گنبدِ نے در کے پار ہو
طاقِ فلک میں مہ سے کرے جا کے ترکتاز

ہے سلطنت کو نقدِ دل و دیں سے دشمنی
اس کا ہے ایک داؤ جہاں گیر، روح باز

لازم ہے فلسفہ کے لئے مرد اک جری
یہ دو جہاں پہ فکر کو کرنا ہے ترک تاز

زندہ دلوں کا خوابِ پریشاں نہیں ہے کیش
دینا ہے یہ تو خاک سے دنیائے نو کو ساز

برون زین گنبدِ در بسته پیدا کرده ام راهے
که از اندیشه بر ترمی پرد آهِ سحر گاهے

تو اے شاهیں نشیمن درچمن کردی ازاں ترسم
هوائے او ببالِ تو دهد پروازِ کوتاهے!

غبارے گشته؟ آسوده نتواں زیستن ایں جا
به بادِ صبحدم در پیچ و منزل برسرِ راهے

زجوئے کهکشاں بگزر. زنیلِ آسماں بگزر
ز منزلِ دل بمیرد گرچه باشد منزلِ ماهے

اگر زاں برقِ بے پروا درونِ او تهی گردد
بچشمم کوهِ سینا می نیرزد با پرِ کاهے

چساں آدابِ محمل را نگه دارند و می سوزند
مپرس از ما شهیداںِ نگاهِ بر سرِ راهے

پس از من شعرِ من خوانند ودریابند و میگویند
جهانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاهے

۳۴

نکل کر گنبدِ در بستہ سے پائی ہے میں نے راہ
کہ برتر فکر سے پرواز میں ہے آہِ صبح گاہ

بسیرا ہے چمن میں تیرا شاہیں، مجھ کو خدشہ ہے
ہوائے باغ کر دیگی تری پرواز کو کوتاہ!

جو تو بن کر غبار آیا نہیں آسودگی ممکن
الجھ بادِ سحر گہ سے، نہ بیٹھا رہ کنارِ راہ

ہو پار اس کہکشاں کی 'جو سے' نیلے آسمانوں سے
کہ مرگ دل ہے منزل خواہ منزل میں ہو ساکن ماہ

اگر اس برقِ بے پروا سے خالی ہو ضمیر اس کا
نہیں ہے طورِ سینا بھی مرے نزدیک بیش از کاہ

چلے خاموش . پاس ان کو رہا آدابِ محفل کا
یہ گھائل اس نظر کے ہیں جو لہرائی کنارِ راہ

مرے اشعار کے خواننده میرے بعد سمجھیں گے
دگرگوں اک جہاں کو کر گیا اک مردِ خود آگاہ

۳۵

گنهگار غیورم مزد بے خدمت نمی گیرم
از آن داغم که بر تقدیر او بستند تقصیرم

ز فیض عشق و مستی برده ام اندیشه را آنجا
که از دنباله چشم مهر عالمتاب می گیرم

من از صبح حسینی نقش بند موج و گردابم
چو بحر آسوده می گردد ز طوفان چاره برگیرم

جهان را پیش ازین صد بار آتش زیر پا کردم
سکون و عافیت را پاک می سوزد بم و زیرم

از آن پیش بتان رقصیدم و زنار بر بستم
که شیخ شهر مرد باخدا گردد ز تکفیرم!

زمانے رم کند از من زمانے با من آمیزند
درین صحرا نمی دانند صیادم که نخچیرم

دل بے سوز کم گیرد نصیب از صحبت مردے
مس تابیدهٔ آور که گیرد در تو اکسیرم

۳۵

میں غیرت مند عاصی ہوں، نہیں ہے مزد خدمت گیر
مجھے دکھ ہے مری تقصیر آس کی بن گئی تقدیر

مرا فکر اس بلندی پر ہے فیضِ عشق و مستی سے
پہنچ کر پیچھے روئے مہر سے ہوتا ہوں دیدہ گیر

میں ہوں صبحِ ازل سے موج اور گرداب کا صانع
سمندر جب ہو آسودہ تو طوفاں سے ہوں چارہ گیر

جہاں کو میں نے مضطر کر دیا صد بار، پہلے بھی
سکون و عافیت کو برق ہے یہ میرا بم اور زیر

ہوا بیتِ بتاں رقصاں میں اور زنار بھی باندھا
کہ شیخِ شہر پائے قربِ حق. کر کے مری تکفیر

کبھی کرتے ہیں رم مجھ سے، کبھی ملتے ہیں خود آ کر
ہیں باداں دشت کے باسی کہ ہوں صیاد یا نخچیر

دلِ بے سوز کو بہرہ ملا کم بزمِ مرداں سے
مسِ تابیدہ لے کر آ، موثر ہو میری اکسیر

جہاں کور است و از آئینهٔ دل غافل افتاد است
ولے چشمے که بیناشد نگاهش بر دل افتاد است

شبِ تاریک و راهِ پیچ پیچ و بے یقیں راهی
دلیلِ کارواں را مشکل اندر مشکل افتاد است

رقیبِ خام سوداست و عاشق مست و قاصد مست
که حرفِ دلبراں داراے چندیں محمل افتاد است

یقینِ موسئے دارد گمانِ کافرے دارد
چه تدبیر اے مسلماناں که کارم بادل افتاد است

گہے باشد که کارِ ناخدائی می کند طوفاں
که از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

۳۶

جہاں ہے بے بصر اور دل کے آئینے سے غافل ہے
یہاں جو آنکھ بینا ہے . اُسی کے سامنے دل ہے

اندھیری رات . رہ پُر پیچ ہے اور بے یقیں راہی
نقیبِ کارواں کے واسطے متکل پہ متکل ہے

رقیبِ خام سودا مست و عاشق مست و قاصد مست
کہ حرفِ دلبراں مقصودِ گوناگوں کا حامل ہے

یقین مومن کا رکھتا ہے، گماں کافر کا رکھتا ہے
ہو چارہ مومنو اب کیا مری مشکل مرا دل ہے

کبھی کرتا ہے کارِ ناخدائی آپ ہی طوفاں
ملا اک موجِ سرکش سے مری کشتی کو ساحل ہے

نمی دام که داد این چشم بینا موجِ دریا را
گهر درسینهٔ دریا حرف بر ساحل افتاد است

نصیبے نیست از سوزِ دروم مرز و بومم را
ردم اکسیر را بر حاکِ صحرا باطل افتاد است

اگر در دل جهانے تازهٔ داری برون آور
که افرنگ از جراحت هائے پنهان بسمل افتاد است!

نہ جانے چشمِ بینا پائی کس سے موجِ دریا نے
گُہر دریا کے سینے میں ، خزف بر روے ساحل ہے

مرے سوزِ دروں سے کچھ نہ پایا میری بستی نے
مری اکسیر کا مصرف خاکِ دشت باطل ہے

اگر تازہ جہاں رکھتا ہے دل میں ، کر عیاں اس کو
کہ افرنگ اِن جراحت ہاے پنہاں ھی سے بسمل ہے

۳۷

نه یابی در جهان یارے که داند دلنوازی را
خود گم شونگه دار آبروئے عشق بازی را

من از کار آورین داعم که با این ذوقِ پیدائی
زما پوشیده دارد شیوه هائے کا سازی را

کسے این معنئی نازک نداند حز ایاز این جا
که مهرِ غزنوی افزون کند دردِ ایازی را

من آن علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
که از تیغ و سپر بیگانه سازد مردِ غازی را!

بهر نرخے که این کالا بگیری سودمند افتد
بزورِ بازوئے حیدر بده ادراکِ رازی را

اگر یک قطره خون داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاهبازی را

اگر این کار را کارِ نفس دانی چه نادانی!
دمِ شمشیر اندر سینه باید نے نوازی را!

۳۷

کہاں محبوب دنیا میں جو سمجھے دلنوازی کو
خودی میں گم ہو ، رکھ لے آبروئے عشق بازی کو

گلہ خالق سے یہ ہے خود نمائی کا وہ رسیا ہے
نہاں رکھتا ہے ہم سے شیوہ ہائے کار سازی کو

فقط جانے ایاز اس کو رس نازک ہیں یہ معنی
فزوں کرتی ہے مہرِ غزنوی دردِ ایازی کو

مریدوں میں نہ وہ علم و فراست ایک تنکے میں
جو بیگانہ کرے تیغ و سپر سے مردِ غازی کو

مناقع کا ہے سودا جس بھی قیمت پر ملے تجھ کو
عوض میں بازوئے حیدر کے دے ادراکِ رازی کو

میسر ہوں تجھے گر قطرۂ خوں اور مشتِ پر
مرے پاس آکے حاصل کر طریقِ شاہبازی کو

تو ناداں ہے اگر اس کام کو کارِ نفس سمجھا
دمِ شمشیر سینے میں ہے لازم نے نوازی کو

۳۸

علمے که تو آموزی مشتاقِ نگاہے نیست
واماندۂ راہے ہست آوارۂ راہے نیست

آدم که ضمیرِ او نقشِ دو جہاں ریزد
بالذتِ آہے ہست بے لذتِ آہے نیست !

ہر چند که عشق او را آوارۂ راہے کرد
داغے که جگر سوزد در سینۂ ماہے نیست

من چشم نه بردارم از روئے نگاریںش
آں مستِ تغافل را توفیقِ نگاہے نیست!

اقبال قبا پوشد در کارِ جہاں کوشد
دریاب که درویشی با دلق و کلاہے نیست!

۳۸

وہ علم جو تو نے سیکھا ہے مشتاق نگاہ نہیں ہوتا
واماندۂ راہ تو ہوتا ہے ، آوارۂ راہ نہیں ہوتا

وہ آدم جسکا قلب ہوا ہے نقش طرازِ ہر دو جہاں
ہو لذتِ آہ تو ہوتا ہے بے لذتِ آہ نہیں ہوتا !

ہر چند کہ ہے سر گرداں وہ اس عشق کے ہاتھوں راہوں میں
مسکن اک داغِ جگر سوزاں کا سینۂ ماہ نہیں ہوتا

اٹھتی ہی نہیں ہے پل بھر بھی اس روئے نگار سے میری نظر
رہتا ہے وہ مستِ تغافل ہی ، مائل بہ نگاہ نہیں ہوتا

اقبال قبا پوشاں[1] بھی رہا اور کارِ جہاں میں کوشاں بھی
لازم درویشی کو خالی یہ دلق و کلاہ نہیں ہوتا

۱ اس ترکیب میں ارادۃً تصرف سے کام لیا گیا ہے

۳۹

چوں خورشیدِ سحر پیدا نگاہے می تواں کردن
ہمیں خاکِ سیہ را جلوہ گاہے می تواں کردن

نگاہِ خویش را از نوکِ سوزن تیز تر گرداں
چو جوہر در دلِ آئینہ راہے می تواں کردن

دریں گلشن کہ بر مرغِ چمن راہِ فغاں تنگ است
باندازِ کشودِ غنچہ آہے می تواں کردن

نہ ایں عالم حجاب او را نہ آں عالم نقاب او را
اگر تابِ نظر داری نگاہے می تواں کردن

"تو در زیرِ درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی"
بہ پرواز آ کہ صیدِ مہر و ماہے می تواں کردن

۳۹

جو تو چاہے تو خورشیدِ سحر سی ہے نگاہ آساں
اسی خاکِ سیہ سے پیدا کرنا جلوہ گاہ آساں

اگر ہوں نوکِ سوزن سے نگاھیں تیز تر تیری
دلِ آئینہ میں جو ہر صفت پانا ہے راہ آساں

ہے گر راہِ فغاں مرغِ چمن پر تنگ گلشن میں
کشودِ غنچہ کے انداز سے ہے ایک آہ آساں

نہ یہ عالم حجاب اُس کو نہ وہ عالم نقاب اُس کو
جو ہو تابِ نظر تجھ میں تو ہوتی ہے نگاہ آساں

درختوں کے تلے تُو مثلِ طفلاں آشیاں چاہے
سرِ پرواز آ غافل، ہے صیدِ مہر و ماہ آساں

۴۰

کشیدی باده‌ها در صحبتِ بیگانه پے در پے
بنورِ دیگراں افروختی پیمانه پے در پے

ز دستِ ساقیٔ خاور دو جامِ ارغواں در کش
که از خاکِ تو خیزد نالهٔ مستانه پے در پے

دلے کو از تب و تابِ تمنا آشنا گردد
زند بر شعله خود را صورتِ پروانه پے در پے

ز اشک صبحگاهی زندگی را برگ و ساز آور
شود کشتِ تو ویراں گر نه ریزی دانه پے در پے

بگرداں جام و از هنگامهٔ افرنگ کمتر گو
هزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانه پے در پے!

۴۰

تو مے آشام ہے در صحبتِ بیگانہ نے در نے
فروزاں نورِ عیراں سے کیا پیمانہ نے در نے

دو جامِ ارغواں لے ساقیٔ خاور کے ہاتھوں سے
تری مٹی سے اٹھے نالۂ مستانہ نے در نے

تب و تاب تمنا سے شناسائی ہو جس دل کو
ہے گرتا شعلہ پر خود صورتِ پروانہ نے در نے

کر اشک صبحگاہی سے تو ساماں زندگانی کا
تری کھیتی ہو ویراں گر نہ ڈالے دانہ نے در نے

نہ کر ہنگامۂ مغرب کا ذکر، اب جام گرداں کر
ہزاروں کارواں دیکھے ہے یہ ویرانہ نے در نے!

۴۱

عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است
جلوهٔ او آشکار از پردهٔ آب و گل است

آفتاب و ماه و انجم می توان دادن ز دست
در بهاے آں کفِ خاکے که داراے دل است

۴۱

رها ہے جستجو میں عشق ، انساں اس کا حاصل ہے
ہے جلوہ آشکار اس کا کہ زیرِ پردۂ گل ہے

جو سورج چاند تارے دے کے ھاتھ آئے تو ارزاں ہے
وہ مشتِ خاک جس میں ایک جیتا جاگتا دل ہے

۴۲

بیاکه خاوریاں نقشِ تازهٔ بستند
دگر مرو بطوافِ بتے که بشکستند

چه جلوه ایست که دلها بلذّتِ نگهے
ز خاکِ راه مثالِ شراره برجستند!

کجاست منزلِ تورانیانِ شهر آشوب
که سینه هائے خود از تیریٔ نفس خستند

تو هم بذوقِ خودی رس که صاحبانِ طریق
بریده از همه عالم بخویش پیوستند

بچشمِ مرده دلاں کائنات زندانے است
دو جامِ باده کشیدند و از جهاں رستند

غلامِ همتِ بیدارِ آں سوارانم
ستاره را بسناں سفته در گره بستند

فرشته را دگر آں فرصتِ سجود کجاست
که نوریاں بتماشائے خاکیاں مستند!

۴۲

ادھر آ ۔ اھلِ خاور نے کیا ہے نقشِ نو پیدا
شکستہ ھوچکا جو بت ۔ نہ کر اب تو طواف اس کا

وہ کیا جلوہ ہے جس کی اک جھلک پانے کو لپکے ھیں
روش کی خاک سے مشتاق دل اٹھ کر شرر آسا

نہ جانے اب ھیں کس منزل میں شہر آشوب تورانی
نفس کی تیزیوں سے جن کے سینوں میں لگا چرکا

خودی کا ذوق پیدا کر ۔ طریقت کے جیالوں نے
سدا دنیا سے توڑا اور جوڑا خود سے ھے ناتا

جو مردہ دل ھیں دنیا کو وہ اک زنداں سمجھتے ھیں
چڑھانے جام دو اور پا گئے دنیا سے چھٹکارا

میں بندہ ھمتِ بیدار کا ھوں ان سواروں کی
ستاروں کو سنانوں میں پرو کر جو کریں یکجا

کہاں فرصت فرشتے کو کہ پھر مشغولِ سجدہ ھو
نظر خاکی پہ ہے ۔ نوری ھوا ہے مستِ نظارا!

۲۳

عشق را نازم که بودش را غم نابود نے
کفرِ او زنّار دارِ حاضر و موجود نے

عشق اگر فرماں دهد از جانِ شیریں هم گزر
عشق محبوب است و مقصود است و جاں مقصود نے!

کافری را پخته تر سازد شکستِ سومنات
گرمئی بتخانه نے هنگامهٔ محمود نے

مسجد و میخانه و دیر و کلیسا و کنشت
صد فسوں از بهر دل بستند و دل خوشنود نے

نغمه پردازی ز جوئے کوهسار آموختم
در گلستاں بوده ام یک ناله درد آلود نے

پیش من آئی؟ دمِ سردے دلِ گرمے بیار
جنبشِ اندر تست اندر نغمهٔ داؤد نے

عیبِ من کم جوئے و از جامم عیارِ خویش گیر
لذتِ تلخابِ من بے جانِ غم فرسود نے

عشق ناداں ہے کہ اس کو غمِ نابود نہیں
کافری عشق کی زنّاریٔ موجود نہیں

عشق اگر کہہ دے تو کر جاں کو بھی اپنی نثار
عشق مقصود ہے یہ جاں تو مقصود نہیں!

سومنات اجڑے تو یہ کافری پختہ تر ہے
گرمیٔ بتکدہ بے شورشِ محمود نہیں

مسجد و میکدہ و دیر و کلیسا و کنشت
سو جتن دل کے لیے دل ہے کہ خوشنود نہیں

جوئے کہسار سے لی میں نے یہ نغمہ ریزی
ایک فریاد بھی گلشن میں غم آلود نہیں

میری مجلس میں دمِ سرد۔ دلِ گرم کو لا
تو ہی خود جنبش ہے یہ نغمۂ داود نہیں

عیب مت گن تو بنا جام مرا اپنا عیار
میرا تلخاب بجز جانِ غم آلود نہیں

۴۵

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے!
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے!

خیالِ ما که او را پرورش دادند طوفاںها
ز گردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے

یکی در معنیٔ آدم نگر! از من چه می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتاده مضمونے
که یزداں را دل از تاثیرِ اوُ پر خوں شود روزے

۴۵

تاب خاکی ہوگی نوری سے بھی افروں ایک دن!
کوکبِ آدم سے ہوگی ارض، گردوں ایک دن!

پالا طوفانوں نے جس کو، وہ حیال انساں ک
ہو گا گردابِ یمِ گردوں سے بیروں ایک د

دیکھ آدم کی حقیقت، پوچھتا ہے مجھ سے کیا
کھلتا ہے فطرت کو اب تک ہوگا موزوں ایک دن

موزوں ہو جائیگا یہ فرسودہ مضموں اس طرح
ہوگا اس کے کیف سے یزداں کا دل خوں ایک دن

۴۶

، رسم و راهِ شریعت نکرده ام تحقیق
جز این که منکرِ عشق است کافر و زندیق!

مقامِ آدمِ خاکی نهاد دریا بند
مسافرانِ حرم را خدا دهد توفیق

من از طریق نه پرسم رفیق می جویم
که گفته اند نخستین رفیق و باز طریق

کند تلافیِ ذوق آن چنان حکیمِ فرنگ
فروغِ باده فزون تر کند بجامِ عقیق

هزار بار نکو تر متاعِ بے بصری
ز دانشے که دل او را نمی کند تصدیق

جو رسم و راہ شریعت کی میں نے کی تحقیق
کھلا کہ عشق کا منکر ہے کافر و زندیق!

مقامِ آدمِ خاکی نہاد تک ہوں رسا
مسافرانِ حرم کو خدا دے یہ توفیق

نہیں طریق کا طالب ، رفیق کی ہے طلب
کہا گیا ہے کہ اول رفیق و بعد طریق

تلافی ذوق کی کرتا ہے یوں حکیمِ فرنگ
فروغِ بادہ بڑھاتا ہے دے کے جامِ عقیق

ہزار بار ہے بہتر متاعِ بے بصری
اس علم سے کہ نہ دل جس کی کر سکے تصدیق

به پیچ و تابِ خرد گرچه لدتِ دگر است
یقینِ ساده دلاں به ز نکته هائے دقیق

کلام و فلسفه ار لوحِ دل وروشستم
صمیرِ خویس کشادم به نشترِ تحقیق

ر آستانهٔ سلطاں کناره می گیرم
نه کافرم که پرستم حدائے بے توفیق!

گو پیچ و تاب خرد میں بھی ہے سرور بہت
یقینِ سادہ دلاں برتر از نکاتِ دقیق

کلام و فلسفہ سے لوحِ دل کو پاک کیا
ہوا ضمیر کشا میرا نشترِ تحقیق

میں آستانۂ سلطاں سے دور دور رہا
یہ کافری ہے کہ پوجوں خدائے بے توفیق!

۴۷

از همه کس کناره گیر صحبت آشنا طلب
هم ز خدا خودی طلب هم ز خودی خدا طلب

از خلش کرشمهٔ کار نمی شود تمام
عقل و دل و نگاه را جلوه جدا جدا طلب

عشق بسر کشیدن است شیشهٔ کائنات را
جام جهان نما مجو دست جهان گشا طلب

راه روان برهنه پا راه تمام خارزار
تا به مقام خود رسی راحله از رضا طلب!

چون به کمال می رسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را در ته بوریا طلب

بیش نگر که زندگی راه بعالمے برد
از سر آنچه بود و رفت درگذر . انتها طلب

صرصر روزگار اگر ناله چو نے دهد ترا
باده من ز کف بنه چاره ز مومیا طلب

ھو کے الگ جہان سے کر صحبتِ آشنا طلب
یزداں سے کر خودی طلب اور ہو خودی خدا طلب

ایک کرشمہ سے فقط ھو گا نہ کامیاب تو
عقل و دل و نظر کے ھوں جلوے جدا جدا طلب

شیشۂ کائنات میں قطرہ نہ چھوڑنا ہے عشق
جامِ جہاں نگر کو تج دستِ جہاں کشا طلب

راھی بہت ہیں ہم سب راہ تمام خار زار
منزل کی ہے لگن تو کر راحۂ رضا طلب!

پہنچا کمال تک تو ہے فقر دلیلِ خسروی
مسندِ کیقباد کو کر تہِ بوریا طلب

آگے کو دیکھ زندگی اور جہاں کا ہے شمار
چھوڑ جو تھا اور اب نہیں حق سے کر انتہا طلب

زخمۂ روزگار دے نالہ جو نے نے تجھے اگر
رکھ دے مرا پیالہ کر چارۂ مومیا طلب

۴۸

بینی جهان را ، خود را نه بینی
تا چند نادان غافل نشینی؟

نورِ قدیمی شب را بر افروز
دستِ کلیمی در آستینی!

بیرون قدم نه از دورِ آفاق
تو پیش ازینی تو بیش ازینی!

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید؟
مرگ است صیدے تو در کمینی

جانے که بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

صورت گری را از من بیاموز
شاید که خود را باز آفرینی!

۴۸

جہاں بیں ہے لیکن تو خود بیں نہیں ہے
تو ناداں ہے مدت سے غفلت نشیں ہے

تو نورِ ازل ہے ، شب افروز ہوجا
یدِ بیضا رکھتی تری آستیں ہے!

نکل دورِ آفاق کے چکروں سے
تو پہلے ہے اس سے . بڑا بھی کہیں ہے!

نہ خائف ہو مرنے سے تو جاوداں ہے
ترا صید ہے مرگ تو در کمیں ہے

عطا کر دیں جب جاں نہیں لیتے واپس
وہ بے جان انساں ہے جو بے یقیں ہے

یہ صورت گری فن ہے ، آ سیکھ مجھ سے
کہ شاید تو خود اپنا باز آفریں ہے

۲۹

من هیچ نمی ترسم از حادثهٔ شب‌ها
شب‌ها که سحر گردد از گردشِ کوکب ها!

نشناخت مقامِ خویشِ افتاد بدامِ خویش!
عشقے که نمودے خواست از شورشِ یارب ها!

آہے که ز دل خیزد از بهرِ جگر سوزی ست
در سینه شکن او را آلوده مکن لب ها

در میکده باقی نیست از ساقیٔ فطرت خواه
آن مے که نمی گنجد در شیشهٔ مشرب ها

آسوده نمی گردد آن دل که گسست از دوست
با قرأتِ مسجد ها با دانشِ مکتب ها!

۴۹

ڈروں اس حادثہ سے کیوں پیا ہوتا ہے جو شب سے
سحر ہو جاتی ہے ہر شب ؛ فقط دورانِ کوکب سے

وہ جانے کیا مقام ایسا ؛ ہے گھیرے اُس کو دام ایسا
نمود اپنی جو چاہے عشق ہر دم وردِ یا رب سے

جو دل سے آہ اٹھتی ہے جگر سوزی کی خاطر ہے
رہے سینہ کے اندر ہی نہ ابھرے وہ کبھی لب سے

نہیں میخانہ میں باقی ، تجھے دے ساقیٔ فطرت
وہ بادہ جو اچھل جائے ہر اک مینائے مشرب سے

جدا ہو کر نگاراں سے دل آسودہ نہیں ہوتا
قرأت مسجدوں سے ہو کہ دانش لائیں مکتب سے!

۵۰

تو کیستی؟ ز کجائی؟ که آسمانِ کبود
هزار چشم براهِ تو از ستاره کشود!

چه گویمت که چه بودی چه کردهٔ چه شدی
که خون کند جگرم را ایازیٔ محمود!

تو آن نهٔ که مصلّئے ز کہکشان میکرد
شرابِ صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود

فرنگ اگر چه ز افکارِ تو گره بکشاد
بجرعهٔ دگرے نشهٔ ترا افزود

سخن ز نامه و میزان دراز تر گفتی
بحیرتم که نه بینی قیامتِ موجود

خوشا کسے که حرم را درونِ سینه شناخت
دمے تپید و گزشت از مقامِ گفت و شنود

ازان بمکتب و میخانه اعتبارم نیست
که سجدهٔ نبرم بر درِ جبین فرسود!

۵۰

کہاں سے ، کون ہے تو ، جانتا ہے چرخِ کبود
ہوئی ہے دیدۂ انجم کی تیری رہ پہ کشود!

تو کیا سے کیا ہوا کیسے ہوا ۔ کہوں میں کیا
جگر مرا ہوا خوں ۔ اب ایاز ہے محمود!

تھا وہ بھی وقت ، مصلیٰ تھا کہکشاں تیرا
شرابِ صوفی و شاعر نے لوٹا تیرا وجود

گرہ کشا ترے افکار کا ورنگ ہوا
پھر ایک جرعہ سے گزرا تو مستیوں کے حدود

کیا ہے نامہ و میزاں کا تو نے ذکر طویل
تری نظر میں نہیں کیوں قیامتِ موجود

خوشا وہ جس نے حرم اپنے سینے میں پایا
تڑپ کے کر گیا طے وہ مقام گفت و شنود

بھروسہ مکتب و میخانہ پر نہیں ہے مجھے
نہیں ہے سجدہ کو شایاں درِ جبیں فرسود!

۵۱

دیارِ شوق که درد آشناست خاک آنجا
بذرّه درّه توان دید جانِ پاک آنجا

مئے مغانه ز مغ رادگان نمی گیرند
نگاه می شکند شیشه هائے تاک آنجا!

به ضبطِ جوشِ جنون کوش در مقامِ نیاز
بهوش باش و مرو با قبائے چاک آنجا!

۵۱

دیارِ شوق که درد آشنا ہے حاک وهاں
هر ایک ذره میں ظاهر ہے جانِ پاک وهاں

مئے مغاں نہیں لیتے هیں مع بچوں سے کبھی
نطر سے ٹوٹتے هیں شیشه هائے تاک وهاں!

نیاز کا ہے تقاصا . هو ضبط جوشِ جنوں
سنبھال هوش ، نه لے جا قبائے چاک وهاں!

۵۲

مئے دیرینه و معشوق جواں چیزے نیست
پیشِ صاحب نظراں حور و جناں چیزے نیست

هر چه از محکم و پاینده شناسی گزرد
کوه و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست

دانشِ مغربیاں فلسفهٔ مشرقیاں
همه بتخانه و در طوفِ بتاں چیزے نیست

از خود اندیش و ازیں بادیه ترساں مگزر
که تو هستی و وجودِ دوجهاں چیزے نیست

در طریقے[1] که بنوکِ مژه کاویدم من
منزل و قافله و ریگِ رواں چیزے نیست!

۱ یعنی راسته

۵۲

مئے دیرینہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں
اہل دیدہ کے لئے حور و جناں کچھ بھی نہیں

جس کو تو سمجھا ہے پایندہ ہے فانی یکسر
کوہ و صحرا و برو بحر و کراں کچھ بھی نہیں

دانشِ مغربیاں ، فلسفۂ مشرقیاں
سب ہی بتخانے ہیں یہ طوفِ بتاں کچھ بھی نہیں

ہو خود اندیش اور اس دشت سے بےخوف گزر
کہ فقط تو ہے ، وجودِ دو جہاں کچھ بھی نہیں

راستہ طے جو کیا نوکِ مژہ سے ۔ اس میں
منزل و قافلہ و ریگ رواں کچھ بھی نہیں!

۵۳

قلندران که به تسخیرِ آب و گل کوشند
ز شاه باج ستانند و خرقه می پوشند

بخلوت اند و کمندے به مهر و ماه پیچند
بخلوت اند و زمان و مکان در آغوشند!

بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروزِ رزم خود آگاه و تن فراموشند

نظامِ تازه بچرخِ دو رنگ می بخشند
ستاره هائے کهن را جنازه بر دوشند!

زمانه از رخِ فردا کشود بندِ نقاب
معاشران همه سر مستِ بادهٔ دوشند

بلب رسید مرا آن سخن که نتوان گفت
بحیرتم که فقیهانِ شهر خاموشند!

۵۳

قلندر رهتے هیں تسخیر آب و گل میں پیہم کوش
وہ شہ سے باج لیتے هیں مگر هوتے هیں خرقہ پوش

کمندیں پھینکتے هیں مہر و مہ پر جب هوں جلوت میں
هیں خلوت میں زمانوں اور مکانوں کے لئے آغوش

هوں بزم آرا تو مثلِ پرنیاں وہ نرم هوتے هیں
هوں رزم آرا تو خود آگہ مگر تن کا نہ رکھیں هوش

نظامِ نو عطا کرتے هیں افلاکِ دو گونہ کو
وہ فرسودہ ستاروں کے جنازے هیں لئے بردوش!

زمانے نے نقاب الٹی رخِ زیبائے فردا سے
مرے همسر مگر اب تک هیں سرمستِ شرابِ دوش

مرے لب پر وہ بات آئی جسے کہنا نہیں ممکن
میں حیراں هوں فقیہِ شہر ہے کس واسطے خاموش

۵۴

دو دسته تیغم و گردون برهنه ساخت مرا
فسان کشید و بروے زمانه آخت مرا

من آن جهانِ خیالم که فطرتِ ازلی
جهانِ بلبل و گل را شکست و ساخت مرا

مئے جوان که به پیمانهٔ تو می ریزم
ز راوقے است که جام و سبو گداخت مرا

نفس به سینه گدازم که طائرِ حرمم
توان ز گرمئی آوازِ من شناخت مرا

شکست کشتئی ادراکِ مرشدانِ کهن
خوشا کسے که بدریا سفینه ساخت مرا!

۵۴

میں ہوں تیغِ دو دستہ جسکو گردوں نے کیا عریاں
لگایا سان پر مجھ کو اٹھایا پھر سرِ دوراں

ہوں وہ عالم خیالوں کا۔ ازل میں دستِ فطرت نے
جہانِ بلبل و گل توڑ کر میرا کیا ساماں

ترے ساغر میں میں نے جو مے سو خیز ڈالی ہے
گداز اس نے کیے ہیں میرے جام و مینا، شعلہ ساں

میں طائر ہوں حرم کا۔ ہے نفس سیال سینے میں
مری آواز کی گرمی سے ہوتا ہے مرا عرفاں

پرانے مرشدوں کی کشتیٔ ادراک ٹوٹی ہے
خوشا وہ جو سفینے کو مرے دریا میں ہے گرداں!

۵۵

مثل شرر ذره را تن به تپیدن دهم
تن به تپیدن دهم، بالِ پریدن دهم!

سوزِ نوایم نگر! ریزهٔ الماس را
قطرهٔ شبنم کنم، خوی چکیدن دهم!

چون ز مقامِ نمود نغمهٔ شیرین زنم
نیم شبان صبح را میلِ دمیدن دهم!

یوسفِ گم گشته را باز گشودم نقاب
تا به تنک مایگان ذوقِ خریدن دهم!

عشقِ شکیب آزما خاکِ ز خود رفته را
چشمِ ترے داد و من لذتِ دیدن دهم!

۵۵

مس ذرے کو شرر صورت ؛ تپش کاساز دیتا ھوں
دل ِ بے تاب دیتا ھوں . پر ِ پرواز دیتا ھوں

مرے سوز ِ نوا سے ریزۂ الماس پانی ہے
میں جوں شمع تراوش کا آسے انداز دیتا ھوں

مقام ِ خود نمائی سے جو نغمہ ریز ھوتا ھوں
سحر کو نیم شب پرتاخت کا اعجاز دیتا ھوں

اٹھایا میں نے روئے یوسف ِ گم گشتہ سے پردہ
مس بے زر کو خریداری کا ذوق وساز دیتا ھوں

دیا ہے عشق نے جو دیدۂ تر خاک ِ بے خود کو
میں اس کو لذت ِ چشم ِ نظارہ باز دیتا ھوں

٥٦

خودی را مردم آمیزی دلیلِ نارسائی ها!
تو اے درد آشنا بیگانه شو از آشنائی ها!

بدرگاهِ سلاطین تا کجا این چهره سائی ها
بیاموز از خداے خویشتن نازِ کبریائی ها!

محبت از جوانمردی بجاے می رسد روزے
که افتد از نگاهش کاروبارِ دلربائی ها!

چنان پیشِ حریمِ او کشیدم نغمهٔ دردے
که دادم محرمان را لذتِ سوزِ جدائی ها!

از آن بر خویش می بالم که چشمِ مشتری کور است
متاعِ عشق نا فرسوده ماند از کم روائی ها

بیا بر لاله پا کوبیم و بیباکانه مے نوشیم
که عاشق را خجل کردند خونِ پارسائی ها

برون آ از مسلمانان گریز اندر مسلمانی
مسلمانان روا دارند کافر ماجرائی ها!

خودی کی مردم آمیزی نشاں ہے نارسائی کا
تو اے درد آشنا ، بیگانہ نہ ہو ہر آشنائی کا

رہے گی در گہِ سلطاں میں کب تک یہ جبیں سائی
سبق پڑھ خود خدا اپنے سے نازِ کبریائی کا

جواں مردی دلائیگی محبت کو مقام اپنا
نظر سے اُس کی گر جائے گا شیوہ دلربائی کا

حریمِ دوست کے باہر وہ میرا درد کا نغمہ
مزا سب محرموں کو دے گیا سوزِ جدائی کا

میں شاداں ہوں کہ میرے مشتری تھے بصرسارے
متاعِ عشق سالم ہے گلہ کیا کم روائی کا

کریں ہم رقصِ لالہ پر ہوئے باکانہ مے نوشی
کہ عاشق کے لیے جائز ہے یہ خون پارسائی کا

مسلمانوں کو تج کر آ ، مسلمانی میں داخل ہو
مسلماں ہو چکا گرویدہ کا فر ماجرائی کا

۵۷

چون چراغ لاله سوزم در خیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما!

غوطه ها زد در ضمیر زندگی اندیشه ام
تا بدست آورده ام افکار پنهان شما

مهر و مه دیدم نگاهم برتر از پروین گذشت
ریختم طرح حرم در کافرستان شما!

تا سنانش تیزتر گردد فرو پیچیدمش
شعله آشفته بود اندر بیابان شما

فکر رنگینم کند نذر تهی دستان شرق
پاره لعلی که دارم از بدخشان شما

می رسد مردی که زنجیر غلامان بشکند
دیده ام از روزن دیوار زندان شما

حلقه گرد من زنید ای پیکران آب و گل
آتشی در سینه دارم از نیاکان شما!

چراغ لاله هوں زینت تمہارے ھی خیاباں کی
عجم والو! قسم مجھ کو تمہاری اور مری جاں کی!

ضمیرِ زندگی میں فکر میرا دور تک اترا
مرے ھاتھ آئی تب دولت تمہارے فکرِ پنہاں کی

نظر میں مہر و مہ آئے نگہ پرویں سے گزری ہے
حرم کر دی زمیں میں نے تمہارے کافرستاں کی!

میں لپٹا آس سے تاکہ نوک اس کی تیز تر کر دوں
تھی آشفتہ تمہاری لو، تھی یالی گو بیاباں کی

دیا مشرق کے بادارون کو مرے فکرِ رنگیں نے
وہ لعل اک جو امانت تھا تمہارے ھی بدخشاں کی

وہ آنے کو ہے توڑے گا جو زنجیریں غلاموں کی
خبر یہ ہے تمہارے روزنِ دیوار زنداں کی

مرے حلقہ میں آؤ۔ پیکران آب و گِل مل کر
میرے سینے میں آتش ہے تمہارے ھی نیاگاں کی!

۵۸

دمِ مرا صفتِ بادِ فرو دیں کردند
گیاه را ز سرشکم چو یاسمیں کردند

نمودِ لالهٔ صحرا نشیں ز خونابم
چنانکه بادهٔ لعلے بساتگیں کردند

بلند بال چنانم که بر سپهرِ بریں
هزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

فروغِ آدمِ خاکی ز تازه کاری هاست
مه و ستاره کنند آنچه پیش ازیں کردند

چراغِ خویش برافروختم که دستِ کلیم
دریں زمانه نهاں زیرِ آستیں کردند

در آبسجده و یاری ز خسرواں مطلب
که روزِ فقرنیاگانِ ماچنیں کردند

۵۸

نفس بخشا گیا[۱] مجھ کو ہو بادِ فرودیں جیسے
کرشمہ میرے اشکوں کا، گیا[۱] ہو یاسمیں جیسے

مرے خوناب سے نکھری نمودِ لالۂ صحرا
شرابِ لعل گوں سے ہو بھرا اک ساتگیں[۲] جیسے

مری پرواز کی رفعت سے نوری بوکھلائے ہیں
چھپا دیکھا ہے ان کو بار ہا زیرِ کمیں جیسے

عمل کی تازگی سے ہے فروغِ آدمِ خاکی
اگے ہیں اک ڈگر پر ماہ و اختر ہوں نگیں جیسے

چراغ اپنا جلایا میں نے دیکھا جب زمانے میں
یدِ بیضا ہوا یوں گم، ہو زیرِ آستیں جیسے

ہو محوِ سجدہ، شاہوں سے نہ ہو امداد کا طالب
کیا تھا روزِ فقر اسلاف نے بھی پاسِ دیں جیسے

۱ گیا ۔ گھوس ۲ ساتگیں ۔ پیالہ

گزر ازانکه ندیدست و جز خبر ندهد
سخن دراز کند . لذتِ نظر ندهد

شنیده ام سخنِ شاعر و فقیه و حکیم
اگرچه نخلِ بلند است برگ و بر ندهد!

تجلّئی که برو پیرِ دیر می نازد!
هزار شب دهد و تابِ یک سحر ندهد

هم از خدا گله دارم که بر زبان نرسد
متاعِ دل برد و یوسفی به بر ندهد

نه در حرم نه به بتخانه یا بم آن ساقی
که شعله شعله به بخشد شرر شرر ندهد!

۵۹

حذر اس کور دیدہ سے جو کچھ بھی جز خبر نہ دے
بہت لسّان ہو لیکن تجھے ذوقِ نظر نہ دے

سنا میں نے سخن . شاعر . فقیہ و فلسفہ داں کا
بہت اونچا ہے نخل آن کا مگر وہ برگ و بر نہ دے!

تجلی جس پہ پیرِ دیر اتنا ناز کرتا ہے
ہزاروں شب کی خالق ہے یہ تابِ یک سحر نہ دے

خدا سے مجھ کو شکوہ ہے . زباں تک پر نہیں آتا
متاعِ دل تو لے جائے . کوئی یوسف مگر نہ دے

حرم میں اور نہ بتخانہ میں پایا میں نے وہ ساقی
جو بخشے شعلہ پر شعلہ . شرارے پر شرر نہ دے!

درین صحرا گذر افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نغمه هاے ساربانے را

اگر یک یوسف از زندانِ فرعونے برون آید
بغارت می توان دادن متاعِ کاروانے را!

۶۰

گزر شاید ہوا صحرا سے تازہ کاروانوں کا
سنا ہے بعدِ مدت میں نے نغمہ ساربانوں کا

جو اک یوسف کسی فرعون کے زندان سے نکلے
گوارا ہے لٹا دینا اثاثہ رہروانوں کا!

٦١

ترا نادان امید غم گساری ها ز افرنگ است؟
دل شاهین نسوزد بهر آن مرغی که در چنگ است

پشیمان شو اگر لعلی ز میراث پدر خواهی
کجا عیش برون آوردن لعلی که در سنگ است

سخن از بود و نابود جهان با من چه می گوئی
من این دانم که من هستم ندانم این چه نیرنگ است

درین میخانه هر مینا ز بیم محتسب لرزد
مگر یک شیشهٔ عاشق که از وی لرزه بر سنگ است

خودی را پرده می گوئی؟ بگو! من با تو این گویم
مدر این پرده را جائی که دامان نگه تنگ است

کهن شاخی که زیر سایهٔ او پر بر آوردی
چو پر گشتی رخت از وی آشیان برداشتن ننگ است

غزل آن گو که فطرت ساز خود را پرده گرداند
چه آید زان غزل خوانی که با فطرت هم آهنگ است

عبث امید ناداں ، بانٹ لیگا غم ترا اورنگ
دلِ شاهیں دکھے کیوں مہرِ طائر جو ہے زیرِ چنگ

ہے وجہِ ننگ میراثِ پدر سے لعل کی خواهش
مزا تب ہے که حاصل هو تجھے لعل درونِ سنگ

نہیں ہے بود و نابودِ جہاں سے مجھ کو دلچسپی
مجھے معلوم ہے میں هوں ۔ نه جانے کیا ہے یه نیرنگ

ہے خوفِ محتسب سے میکده میں لرزاں هر مینا
مگر عاشق کے مینا سے لرزتا رهتا ہے خود سنگ

خودی کو پرده نے شک کہه مگر یه قول میرا سن
نه کرنا چاک یه پرده که دامانِ نگه ہے تنگ!

وه ڈالی جس کے سائے میں نکالے بال و پر تو نے
هو جب پت جھڑ اٹھا لینا ہے اس سے آشیانه ننگ

غزل وه کہه که بدلے فطرت اپنے ساز کا پرده
غزل خواں ہے وه کس قابل جو فطرت سے ہے هم آهنگ

بگزر از خاور و افسونئی افرنگ مشو
که نیرزد بجوے این همه دیرینه و نو

چون پر کاه که در رهگزر باد افتاد
رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو

زندگی انجمن آرا و نگهدار خود است
اے که در قافلهٔ بے همه شو با همه رو

تو فروزنده تر از مهر منیر آمدهٔ
آنچنان زی که بهر ذره رسانی پر تو!

آن نگینے که تو با اهرمنان باختهٔ
هم بجبریل امینے نتوان کرد گرو

از تنک جامئی ما میکده رسوا گردید
شیشهٔ گیر و حکیمانه بیاشام و برو

٦٢

نه هو گرویدۂ مغرب نه هو مشرق کا تو پیرو
که اک جوّ کے برابر بھی نہیں دیرینه هو یا نو

هو جیسے تنکا کوئی ره گزارِ باد میں گرداں
گئے اسکندر و دارا. گئے جمشید و کیخسرو

ہے هستی انجمن آرا نگہباں بھی ہے خود اپی
شریکِ قافله ! دے ساتھ سب کا پر هو تنہا رو

تو ہے خورشیدِ عالم تاب سے بڑھکر فروزنده
بسر کر یوں که هر اک درّے تک پہنچے ترا پرتو !

نگینه جو تو هار آیا ہے شیطاں کے مریدوں کو
نہیں کر سکتے جبریلِ امیں کے پاس بھی وه گرو

همیں کم حوصله نکلے. کیا میخانے کو رسوا
هو مے آشام مینا سے حکیمانه به عزمِ نو

جهانِ رنگ و بو پیدا تو می گوئی که راز است این
یکے خود را بتارش زن که تو مضراب و ساز است این

نگاهِ جلوه بدمست از صفاتِ جلوه می لغزد
تو می گوئی حجاب است این نقاب است این مجاز است این!

بیا در کشتِ طنابِ پرده هائے نیلگونش را
که مثلِ شعله عریان بر نگاهِ پاک باز است این

مرا این خاکدانِ من ز فردوسِ برین خوشتر
مقامِ ذوق و شوق است این حریمِ سوز و ساز است این!

زمانے گم کنم خود را زمانے گم کنم او را
زمانے هردو را یابم! چه راز است این! چه راز است این!

طاهر دنیا رنگ و بو کی ، تو کہتا ہے کہ راز ہے یہ
اس کے تار پہ حو دھی گر جا ، تو مضراب ہے ساز ہے یہ

مست صفائے جلوہ سے ہے آپ نگاہِ جاوہ بھی
کہتا ہے تو کہ حجاب ہے یہ ؛ کہتا ہے تو کہ مجاز ہے یہ !

کھینچ طناب اک جنبش سے تو اس کے نیلگوں پردوں کی
نگہ اگر پاکیزہ ہو ؛ جوں شعلہ جلوہ بار ہے یہ

عرش بریں سے افضل ہے یہ خاکی بستی میرے لیے
ہے یہ مقامِ ذوق و شوق اور بزمِ سوز و ساز ہے یہ !

اپنے آپ کو کھویا کبھی . کھویا ہے اس کو میں نے کبھی
ہر دو کبھی پا لیتا ہوں حیراں ہوں میں کیا راز ہے یہ !

۶۴

از داغِ فراقِ او در دل چمنے دارم
اے لالۂ صحرائی ! با تو سخنے دارم

ایں آہِ جگرسوزے در خلوتِ صحرا بہ
لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم!

٦٤

داغِ فراقِ یار سے دل ہے چمن مثال
کہتا ہے مجھ کو لالۂ صحرا سے اپنا حال

طالب ہے خلوتوں کی مری آہِ سینہ سوز
لیکن بچھا ہے گرد مرے انجمن کا جال

۶۵

به نگاهِ آشنائے چو درونِ لاله دیدم
همه ذوق و شوق دیدم همه آه و ناله دیدم

به بلند و پستِ عالم تپشِ حیات پیدا
چه دمن چه تل چه صحرا رمِ این غزاله دیدم!

نه به ماست زندگانی! نه زماست زندگانی!
همه جاست زندگانی! زکجا ست زندگانی!

٦٥

جو نگاہِ محرمانہ سے دیکھا درونِ لالہ
ہمہ ذوق و شوق پایا تھا سراپا آہ و نالہ

بہ بلند و پستِ عالم تب و تابِ زندگی ہے
ہے جہاں کے گوشہ گوشہ میں خراماں یہ غزالہ!

نہ وہاں سے زندگانی، نہ یہاں سے زندگانی!
سرِ کیمیں آکے چھائی ہے کہاں سے زندگانی!

٦٦

این هم جهانے آں هم جهانے
این بیکرانے آں بیکرانے!

هر دو خیالے هر دو گمانے
از شعلهٔ من موجِ دخانے!

این یک دو آنے آں یک دو آنے
من جاودانے من جاودانے!

این کم عیارے آں کم عیارے
من پاک جانے نقدِ روانے!

این یک دو آنے آں یک دو آنے
این جا زمانے آنجا زمانے

٦٦

یہ بھی جہاں ہے وہ بھی جہاں ہے
یہ بے کراں ہے وہ بے کراں ہے!

ہر ایک نقشِ وہم و گماں ہے
شعلے مرے کی موجِ دخاں ہے!

یہ لحظہ بھر ہے وہ لحظہ بھر ہے
یہ خاک زادہ ہی جاوداں ہے!

میزاں میں یہ کم میزاں میں وہ کم
جاں پاک میری نقدِ رواں ہے!

یہ بھی سرا ہے وہ بھی سرا ہے
یاں اک زماں ہے واں اک زماں ہے

ایں حاجه کارم آنخا چه کارم؟
آبے معانے آبے وعانے

ایں رهزنِ من آں رهزنِ من
ایں حا زیانے آجا زیانے

هر دو فرورم هر دو سورم
ایں آشیانے آں آشیانے!

یاں کام میرا واں کام میرا
آہ و فغاں ہے آہ و فغاں ہے

یہ میرا رہزن وہ میرا رہزن
اس جا زیاں ہے اُس جا زیاں ہے

ہر دو اجالوں ، ہر دو جلاؤں
یہ آشیاں ہے وہ آشیاں ہے!

بهار آمد نگه می غلطد اندر آتشِ لاله
هزاران ناله خیزد از دلِ پرکاله پرکاله!

فشاں یک جرعه بر خاکِ چمن از بادهٔ لعلے
که از بیمِ خزاں بیگانه روید نرگس و لاله

جهانِ رنگ و بو دانی ولے دل چیست، می دانی؟
مهے کز حلقهٔ آفاق سازد گردِ خود هاله!

٦٧

بہار آئی نگہ دوڑی درونِ آتشِ لالہ
ہزاروں نالے ہیں اور دل مرا پرکالہ پرکالہ!

گرا خاکِ چمن پر بادۂ لعلیں کا اک جُرعہ
کہ آگئے میں بلا خوفِ خزاں ہوں نرگس و لالہ

جہانِ رنگ و بو کو جانتے ہو. دل کو بھی جانو
یہ مہ ہے، حلقۂ آفاق جس کے گرد ہے ہالہ!

۶۸

صورت گرے کہ پیکر روز و شبِ آفرید
از نقشِ این و آن بہ تماشاے خود رسید

صوفی! برون ز نگہ تاریک پابنہ
فطرت متاعِ حویش بسودا گری کشید!

صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب
بے پردہ جلوہ ہا بنگاہے توان حرید!

۶۸

طرح ڈالی ہے جس نے روز و شب کی ، وہ صنم آرا
جہاں کی نقش ریزی سے ہے کرتا اپنا نظارا

نکل اے صوفیٔ صافی تو اب تاریک حجرے سے
سرِ بازار لایا مال حود فطرت کا بنجارا!

شفق ہو، صبحِ خنداں ہو مہ و خورشید و اختر ہو
ہو توفیقِ نظر تجھ کو تو ہر اک سے اٹھے پردا

٦٩

مار این عالمِ دیرینه جوان می بائست
برگِ کاهش صفتِ کوهِ گران می بائست

کفِ خاکے که نگاهِ همه بین پیدا کرد
در ضمیرش جگر آلوده فغان می بائست

این مه و مهرِ کهن راه بجائے نه برند
انجمِ تازه به تعمیرِ جهان می بائست

هر نگارے که مرا پیشِ نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوشتر ازان می بائست

گفت یزدان که چنین است و دگر هیچ مگو
گفت آدم که چنین است و چنان می بائست!

۶۹

اک بار پھر یہ عالمِ فرسودہ جواں ہو
تنکا بھی اس کا مرتبے میں کوہِ گراں ہو

جس مشتِ خاک کو ملی ہے چشمِ جہاں بیں
اس کے ضمیر میں جگر آلودہ فغاں ہو

اں کہہ مہر و ماہ کی منزل نہیں کوئی
پھر انجمِ نوخیز سے تعمیرِ جہاں ہو

ہے خوب ہر نگار جو پیشِ نظر رہا
زیبا تر اس سے اور اک محبوب عیاں ہو

فرمانِ حق تھا چپ رہو، جو ہے سو ہے، یہاں
انساں مگر یہ کہہ اٹھا، اک تازہ جہاں ہو!

۷۰

لالهٔ این گلستان داغِ تمنّاے نداشت
نرگسِ طنّازِ او چشمِ تماشاے نداشت

خاک را موجِ نفس بود و دلے پیدا نبود
زندگانی کاروانے بود و کالاے نداشت

روزگار از هاے و هوے میکشان بیگانهٔ
باده در میناش بود و باده پیماے نداشت

برقِ سینا شکوه سنج از بے زبانی هاے شوق
هیچ کس در وادیٔ ایمن تقاضاے نداشت!

عشق از فریادِ ما هنگامه ها تعمیر کرد
ورنه این بزمِ خموشان هیچ غوغاے نداشت!

گلشن کے لالہ دل میں داغِ تمنا کوئی نہ تھا
نرگسِ شہلا کے دیدہ میں ذوقِ تماشا کوئی نہ تھا

خاک میں موجِ نفس ساری تھی لیکن دل سے یہ عاری تھی
قافلۂ ہستی گرچہ رواں تھا۔ اس کا کالا[۱] کوئی نہ تھا

بادہ کشوں کے نعروں سے بیگانہ رہا تھا دورِ زماں
لبریز تھا مے سے آسکا مینا۔ بادہ پیما کوئی نہ تھا

برقِ سینا کو یہ گلہ تھا شوق ہے کیوں محرومِ زباں
وادیٔ ایمن کی وسعت میں اہلِ تقاضا کوئی نہ تھا

عشق ہماری فریادوں سے کرتا رہا ہنگامے بپا
ورنہ یہ تھی بزمِ خموشاں اس میں غوغا کوئی نہ تھا!

۱ کالا ۔ ساماں

۷۱

هنگامه را که بست درین دیرِ دیر پائے
سیاریانِ او همه نالنده هم چو نائے!

در بنگهٔ فقیر و بکاشانهٔ امیر
غمها که پشت را بجوانی کند دوتائے

درماں کجا که درد بدرماں فزوں شود
دانش تمام حیله و نیرنگ و سیمیائے

نے زورِ سیل کشتیٔ آدم نمی رود
هر دل هزار عربده دارد به ناخدائے

از من حکایتِ سفرِ زندگی مپرس
در ساختم بدرد و گزشتم غزل سرائے

آمیختم نفس به نسیمِ سحر گہی!
گشتم درین چمن به گلاں نا نهاده پائے

از کاخ و کو جدا و پریشاں بکاخ و کوئے
کردم بچشمِ ماه تماشائے ایں سرائے!

۷۱

ہنگامہ کس نے دیرِ کہن میں کیا بپا؟
نالے پجاریوں کے ہیں از ارض تا سما!

کاشانۂ امیر میں ۔ دارِ فقیر میں
غم ایسے ہیں جو پشتِ جواں کو کریں دوتا

درماں کہاں ۔ دوا سے اگر درد ہو فزوں
دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیا

بے زورِ سیل کشتئ آدم نہ چل سکے
ہر دل کی سعی ہے یہی راضی ہو ناخدا

مجھ سے حکایتِ سفرِ زندگی نہ پوچھ
میں نے نبھائی درد سے گزرا غزل سرا

میں نے نفس نسیمِ سحر میں ملا دیا!
گزرا ہوں یوں چمن سے نہیں پھول زیرِ پا

آوارہ کاخ وکوُ میں ۔ الگ کاخ و کو سے ہوں
دیکھی ہے چشمِ ماہ سے میں نے یہ غم سرا!

۷۲

اے لاله اے چراغِ کہستان و باغ و راغ
در من نگر که می دهم از زندگی سراغ

ما رنگِ شوخ و بوئے پریشیده نیستم
مائیم آنچه می رود اندر دل و دماغ

مستی ز باده می رسد و از اياغ نیست
هر چند باده را نتوان خورد بے اياغ

داغے بسینه سوز که اندر شبِ وجود
خود را شناختن نتوان جز بایں چراغ

اے موجِ شعله ـ سینه به بادِ صبا کشائے
شبنم مجو که می دهد از سوختن فراغ!

۷۲

اے لالہ! اے چراغِ کہستان و باغ و راغ
دیکھو مجھے کہ دیتا ہوں ہستی کا میں سراغ

اک رنگِ شوخ و بوئے پریشاں نہیں ہیں ہم
ہم وہ ہیں جو رواں ہے درونِ دل و دماغ

مستی شراب سے ہے ۔ نہیں ہے ایاغ سے
ممکن نہیں ہے میکشی ہر چند ہے ایاغ

اک داغ سینہ میں جلا ۔ ہستی کی رات میں
پہچان اپنی کے لئے لازم ہے یہ چراغ

اے موجِ شعلہ سینہ کشا ہو صبا کے رخ
شبنم نہ کر طلب کہ جو دے سوز سے فراغ!

۷۳

من بندهٔ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

هنگامهٔ این محفل از گردشِ جامِ من
این کوکبِ شامِ من این ماهِ تمامِ من

جاں در عدم آسوده بے ذوقِ تمنا بود
مستانه نوا ها زد در حلقهٔ دامِ من

اے عالمِ رنگ و بو این صحبتِ ما تاچند
مرگ است دوامِ تو عشق است دوامِ من!

پیدا بضمیرم او پنهاں بضمیرم او
این است مقامِ او دریاب مقامِ من!

فطرت مری آزاد ہے ۔ عشق مرا امام ہے
عشق مرا امام ہے ۔ عقل مری غلام ہے

رونقِ بزم کا سبب ۔ گردش ہے میرے جام کی
یہ مرا اخترِ مساء ۔ میرا مہِ تمام ہے

جاں تھی عدم میں بے تپش ۔ تھا جو نہ ذوقِ آرزو
مست ہے اُس کی اب ہوا ۔ میری اسیرِ دام ہے

عالمِ رنگ و بو تری کب تک یہ مجھ سے صحبتیں
تیرا دوام مرگ ہے ۔ عشق مرا دوام ہے

میرے ضمیر میں عیاں ۔ میرے ضمیر میں نہاں
اس کے مقام سے سمجھ میرا بھی کیا مقام ہے

۷۴

کم سخن غنچه که در پردهٔ دل رازے داشت
در هجومِ گل و ریحان غمِ دمسازے داشت

محرمے خواست ز مرغِ چمن و بادِ بهار
تکیه بر صحبتِ آن کرد که پروازے داشت!

۷۴

غنچۂ کم سخن کے دل کی تہہ میں ایک راز تھا
ریحان و گل تھے جا بجا۔ اُس کو غمِ دمساز تھا

یہ چاہا محرم اُس کے ہوں۔ مرغِ چمن بادِ بہار
تکیہ کیا اُن پر کہ جن کا کام ہی پرواز تھا!

۷۵

خود را کنم سجودے دیر و حرم نمانده
این در عرب نمانده آں در عجم نمانده

در برگِ لاله و گل آں رنگ و نم نمانده
در ناله هاے مرغاں آں زیر و بم نمانده

در کار گاهِ گیتی نقشِ نوی نه بینم
شاید که نقشِ دیگر اندر عدم نمانده

سیاره هاے گردوں بے ذوقِ انقلابے
شاید که روز و شب را توفیقِ رَم نمانده!

بے منزل آرمیدند پا از طلب کشیدند
شاید که خاکیاں را در سینه دم نمانده

یا در بیاضِ امکاں یک برگِ ساده نیست
یا خامهٔ قضا را تابِ رقم نمانده

۷۵

سجدہ کروں میں خود کو ۔ دیر و حرم نہیں ہے
مفقود یہ عرب سے ۔ وہ در عجم نہیں ہے

اب برگِ گل کے رخ پر وہ رنگ و نم نہیں ہے
نالوں میں طائروں کے وہ زیر و بم نہیں ہے

گیتی کی کارگہ میں دیکھا یہ نقشِ تازہ
نقشِ دگر کا حامل شاید عدم نہیں ہے

حالت بدلنا بھولے سیارے آسماں کے
شاید کہ روز و شب کو توفیقِ رم نہیں ہے

منزل بغیر ٹھیرے ، پاؤں طلب سے روکے
شاید کہ خاکیوں کے سینہ میں دم نہیں ہے

خالی بیاضِ امکاں میں یا ورق نہیں اب
یا خامۂ قضا میں تابِ رقم نہیں ہے!

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۱	مئے	می
۲۵	۴	ترے	تیرے
۳۲	۵	خاک بر	خاک را بر
۳۵	۲	دائے	دانے
۴۲	۴	برسیدن	برسیدں
۴۶	۱	ھوائے	وائے
۹۱	۳	نہ ترکس سے گر نکلا	ترکش سے نہ گر نکلا
۱۰۸	۴	رادۂ	ردۂ
۱۱۲	۳	سرو' زندی	سرود' زندگی
۱۱۲	۴	سکب	نشب
۱۳۱	۳	ہوں	ہو
۱۳۵	۴	کہ	کہہ
۱۴۲	۴	قومیت	دوسے است
۱۴۸	۳	ورد	ورو
۱۴۹	۲	ائے نا تو	نائے تو
۱۶۰	۴	سمان	ستان
۱۷۲	۵	گمس	گفتمش
۱۷۳	۵	زبر زبر	زیر و زبر
۱۷۹	۵	عجم	عجم
۱۶۴	۶	اندر	اند
۱۹۹	۲	گسید	گسد
۲۰۴	۴	موسئے	موسیے دارد گہان
۲۳۱	۱	حہاں	جہاں
۲۷۶	۳	ایں	ایں